URDU LITERATURE READERS

توزک اردو

TUZUK-I-URDU

(ENLARGED EDITION)

COMPILED & ANNOTATED

BY

MAULVI MUHAMMAD ISMAIL,

(Formerly of the U. P. Education Service)

AND

ADOPTED AS TEXT-BOOK

FOR

THE SCHOOL LEAVING CERTIFICATE EXAMINATION

BY

The Director of Public Instruction, United Provinces of Agra and Oudh.

1934.

LUCKNOW:

PRINTED BY K. D. SETH, AT THE NEWUL KISHORE PRESS.

 [*Price, Rs. 1-8 per copy.*

فہرست مضامین توزک

حصۂ نثر

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ نثر

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے سی ایس آئی۔ ایل ایل ڈی

ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء سرسید نے علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی۔ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق دونوں ان کی اڈیٹری میں نکلتے تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تفسیر القرآن ہے۔ چھ جلدوں میں انکا طرز تحریر سادگی و روانی و دلنشینی میں مشہور ہے تکلف نام کو نہ تھا مشکل سے مشکل مضمون کو اس خوبی سے بیان کرتے کہ گویا پانی کر کے بہا دیتے تھے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اردو زبان کے علم ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا پرتو اس پر پڑا وہ زیادہ تر سرسید ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اُن کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

سولزیشن یا تہذیب (از تہذیب الاخلاق)

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں۔ کہ سولزیشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اسکے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جسے لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے کہ اُس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اُس کا تعلق ہے۔ وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے اس امر کے تصفیہ کے لیے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں

شہریوں میں سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں اِلّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُس کی طبیعت اِس طرف مائل ہے۔ کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے۔ جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہی چیز سِوِلزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ میلان یا یہ خواہش مبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سِوِلزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خِلقی اور خُلقی۔ ملکی اور تمدّنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہراتے ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ قوموں کی سِوِلزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے۔ تو اکثر اُنکی

ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔ اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ اور اِسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہ ہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی۔ کہ جو سولزیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کرسکے۔

مُلکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بودوباش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے۔ جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے اور جس کے باعث سے خواہش تبادلہ تحریک مین آتی ہے اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کرسکتے ہیں۔ جنکے سبب سے اچھّے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات اور علم طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے ؟

کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادّی یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسایش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر۔ یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرایش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرایش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونپے درختوں پر باندھے ہوے ٹانڈ زینت

میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزوں تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں۔ خاطر و مدارات کے کام اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے ان کی ادا اور آواز کی پھرت۔ اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اُونچ نیچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال اور راگ راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر اُن کی لے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا۔ دل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن خنیاگری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے

پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنے سے اعلے درجہ کی طرف تحریک ہوسکتی ہے اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعالِ ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات معاشرت۔ طریق تمدّن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اسکا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی۔ جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین۔ حقیقی وقار۔ اور خود اپنی عزّت کی عزّت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

(سیّد احمد خان)

عزّت

،از تہذیب الاخلاق،

بہت کم لوگ ہیں۔ جو اس کی حقیقت جانتے ہوں۔ اور بہت کم ہیں جو اس کے مشتقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں جن کی لوگ بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اسی کو لوگ معزّز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ اوصافِ ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت، حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ معزز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہو اُس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے یہی حال انسان کا ہے:۔ جب تک اس کی حالت بھی عزت کے قابل نہو۔ وہ معزز نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل بلکہ قریب ناممکن کے ہے۔ پس ان کا کسی کو معزز سمجھنا درحقیقت اس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا اور معزز سمجھتا ہو جس کو انگریزی میں سیلف رسپیکٹ کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بنا کر کہتا ہے۔ تو خود اُس کا دل اس کو ٹوکتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ گو سننے والا اس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزتوں میں کا ایک بے عزت ہے۔

اِسی طرح تمام افعال انسان کے۔ جو صِرف ظاہری نمایش کے طور پر کیے جاتے ہیں۔ گو لوگ اُن کی عزت کرتے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ

عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزت کے لائق وہی کام ہیں جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔ اس لیے انسان کو انسان بننے کے لیے ضرور ہے کہ تمام اس کے کام سچائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کی عزت ہمارا دل نہ کرتا ہو کسی سے ہم اظہارِ دوستی اور محبت کا نہ کریں اگر درحقیقت ہمارے دل میں اس سے ویسی ہی محبت اور دوستی نہ ہو جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو۔

صلح کل ہونا" اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ سب سے اِس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ تو یہ تو نفاقِ اکبر ہے ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کا دوست ہوتا ہے اور اگر اس کے یہ معنی ہوں۔ کہ کسی سے بغض عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے کسی کا بُرا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی بُرائی نہ چاہے وہ بلا شبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے اس میں دو چیزیں یعنی عداوت (کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو) اور محبت سما نہیں سکتی۔ وہ ایسی کلھیا نہیں ہے جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبت کا۔ ایک عداوت کا۔ اور اس لیے یہ دو چیزیں گو اشخاص متعدد اور حیثیات مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں دل میں سما نہیں سکتیں۔ اس لیے انسان کو لازم ہے کہ محبت کے سوا کسی دوسری چیز کے لانے کا دل میں خیال ہی نہ کرے۔ اور ایسی ہی زندگی انسان کے لیے عمدہ زندگی ہے۔

(سید احمد خاں)

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ

از تہذیب الاخلاق

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ

ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہونچایا۔ اور اس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصوّر قدرت نے کھینچ رکھی ہے دکھایا۔ درحقیقت میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا سُنا کرتا تھا بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہونچا۔ تو ایک چار دیواری دیکھی۔ جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمت سے بھی زیادہ مضبوط تھی قدرت نے ایسا سنہرا رنگ دیا تھا۔ کہ جب سورج کی کرن اس پر پڑتی۔ تو وہ دیوار زرنگار کندن کی طرح چمکتی جس سے آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتی اس دیوار کے چاروں طرف پھرا۔ پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے۔ اور ایک بلندی پر چشمہ دیکھا۔ جس سے نہر میں پانی گرتا ہے۔

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرد تھا اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا پُر فضا باغ ہو

جسے جنّت عدن بھی دیکھے۔ تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے شاداب کرنے کے لیے بنائی گئی ہے"۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا۔ اپنے رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا۔ اور میں نے اس کی کامل اطاعت اور بڑی تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا۔ میں اس دروازہ کی محراب کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیا بیان کروں! میں جاتے ہی بے تابانہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سیر سے سیر ہونا چاہا۔ میری اس بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا۔ کہ "اے نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر کیا آسان ہے! جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد ابد ہے"۔

خیر! مَیں نے ہوس کو روکا۔ اور خرد نے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس کے بعد چند کیاریاں اس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر اُن کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا۔ قمری کی آواز۔ بلبلوں کا پھولوں پر گرنا۔ پھولوں کا کھلنا۔ کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظربازی اور شمشاد کی سروقدی نے مجھے ایسا مست کر دیا کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔

مَیں چندے اس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا اور اس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور باہر نکلا۔ کہ کوئی مجھ سا ملے۔ تو یہاں لاؤں اور اپنا دل

خوش کروں۔
میں اس باغ سے نکل کر برسوں اسی تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ ملا آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھلا ہوا دیوار شکستہ اور کچھ نئی قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا کہ یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب ؟ کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے نہ دروازہ کی وہ رفعت و شان۔ چشمہ بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے ؟ اس نے کہا۔ کہ "یہ وہ باغ نہیں ہے۔ دوسرا ہے۔ پہلے اُسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا"
جب میں باغ کے اندر گیا۔ تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر نہ وہ صفائی۔ نہ وہ خوبی۔ نہریں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی کی وہ لطافت۔ نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے۔ سب کمھلائے ہوئے۔ میوے جس قدر تھے۔ وہ سوکھے پڑے ہوئے۔ سبزہ کے زمردیں رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی، گلوں کی سرخی پر زردی آگئی تھی۔ نسیم کے بدلے صرصر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ اپنی خشکی پر رو رہی تھی۔

میں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہونچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں! کہ چند خوبصورت ماہرو نوجوان آئے۔ اور اس نہر میں پانی پینے اور غوطہ لگانے لگے۔ جب وہ نہا دھوکر اس سے نکلے۔ تو اُن کے چہرے بدلے ہوئے نظر آئے۔ نہ وہ شکل و شمائل تھی۔ نہ وہ نزاکت و نرمی اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے کہ کسی کا سینگ ٹوٹا کسی کا چہرہ بگڑا۔ کسی کا غصہ سے چہرہ لال ہوا کسی کا کف منھ سے اُڑکر مجھ تک پہونچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصہ کے تن گئیں کسی کے منھ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی اسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالیشان مکان کی طرف چلے میں بھی ساتھ ساتھ ہولیا۔ کہ دیکھوں۔ کیا ہوتا ہے؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا۔ دم طاؤس کی۔ منھ چڑیا کا پیٹ بیل کا۔ چال لومڑی کی ایک رنگین سمور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹرغوں کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان اس کے پاس پہونچے تو اُس کے آگے گر پڑے۔ اُس نے ایک کریہہ ہولناک آواز سے اُن کو پکارا۔ اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ اُن لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں اسے جواب دیا کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا کہ اس وحشی آدمی نے کچھ خوش ہوکر کسی کا منھ چوما۔ کسی کو پیار کیا۔ اور کسی کو "مرحبا" کہا۔

مین اس معاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے اس اسرار کی خبر پوچھی۔ اس نے کہا کہ "اس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے۔ کہ سب ایسی شکل کے ہو جاتے ہیں۔ جیساکہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان۔ نازک ماہرو لڑکے بھی جب زیادہ پانی پییں گے۔ خوب غوطے نہر میں لگائیں گے تو ایسے ہی ہو جائیں گے اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ بلکہ ان کا علمی مباحثہ تھا۔ جسکے لفظ بھی تمھاری سمجھ میں نہ آئے۔"

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا۔ تو رہنما مجھے چشمہ کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ چشمے کے دہانہ پر دو چشمے آکر ملے ہیں ایک تو سیدھا چلا گیا ہے۔ جو کہ نہایت صاف۔ پاک اور خوش گوار ہے دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے۔ جس میں جابجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں جو کہ سب کثیف میلی اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمے کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے۔ جس سے صاف پانی نہیں آسکتا۔ مگر دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اُسی کا میلا بدبودار زہریلا پانی گرتا ہے۔ اور وہی باغ میں جاتا ہے جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامے رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدت بعد سب حال دریافت کر کے اِس فکر میں پڑا۔ کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب تالیف

تاے ایک روشن ضمیر ملا۔ اُس نے کہا۔ کہ ہزار برس ہوتے ہیں۔ تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تروتازہ۔ سبزوشاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو ہم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گدلے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آگیا ہے۔

تب تو میں نے خیال کیا۔ اِس پتھر کو ہٹادوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لے کر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچاکر ہٹا میرے رہنما نے کہا۔ کہ اور بھی تیری طرح اس ارادہ پر آئے۔ مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں۔ جس کی روشنی سے یہ اندھے ہوکر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ بصیرت کی مشعل اس نے مجھے دی درحقیقت جب میں وہاں مشعل لے کر پہونچا۔ تو کوئی میرے پاس نہ آیا آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ ہمدردی نامے واعظ میرے سامنے آیا اور کہا۔ کہ "مجھے اجازت دو۔ تو کچھ مدد کرنے والے لے آؤں"۔ میں نے خوش ہوکر اُسکا شکر کیا اور بڑے زور شور سے اسے اپنی ہی صورت شکل والوں پاس بھیجا پر افسوس! کہ بہت کم لوگوں نے اس کی بات سنی۔ جو لوگ اس نہر کا پانی پی چکے تھے۔ وہ تو مارنے کو دوڑے۔ اور جو لوگ ابھی اُس سے بچے ہوئے تھے اُن کے کان بھرے تھے۔ اُنھوں نے کچھ نہ سنی۔ آخر وہ باحسرت

ویاس واپس آیا۔ اُس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا۔ کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا رکھا ہے ویسا ہی رہنے دوں پر استقلال نامے ایک رجز خوان نے میرا دل بڑھایا۔ اور مجھے ایک تدبیر بتائی اس نے کہا "میں نے ایمان نامے فقیر سے سنا ہے۔ کہ اس چشمہ کا ایک کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اول تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے۔ جہاں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی و بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہونچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے۔ تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمھاری رسائی ہوئی۔ اور اُس نے تمھاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمھارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ جو آب بند ہو رہی ہیں تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کرینگے اور تمھارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے۔ آخر چند ہی روز میں گد لے چشمہ کا پانی بند کر کے صاف

چشمہ کے پانی سے اپنی نہریں بھرلیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔ تب یہ سوکھا ہوا باغ اس ہرے باغ سے بھی تمھاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوشنما معلوم ہوگا۔ کیونکہ نہ وہ باغ تمھارا باغ ہے۔ نہ وہاں کوئی تم سا ہے اور یہ باغ تمھارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں"۔ میں نے اس رفیق کا شکر کیا اور اس کے کہنے کے مطابق چلا۔ کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے؟

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصّہ کہا۔ تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہ کر کہ جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا۔ وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا۔ وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ ندّی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی۔ نیکی نما تعصب۔ علم نما نادانی جھوٹا زہد۔ جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقریر۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے چپ ہو رہا۔

خواجہ الطاف حسین حالی

زبانِ گویا

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی۔ شیوہ بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو۔ نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا ترا ایک کھیل ہے جسکے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ ہماری ذلت۔ ہماری نیکنامی ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے۔ اور تو اس کی کنجی دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔ اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو

یہ امید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بولے۔ اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبوں ہے۔ بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے منھ میں اور دوسرے کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ انکا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا۔ اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام۔ جھگڑا اور ضلع جگت اور پھبتی غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پہ کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائینگے ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ!

وہ نام کے جانور۔ اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بنکر آئیں۔

(حالی)

حیات سعدی

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص ہے سرگور اوسلی نے اسکی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفرالدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اس لیے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم

نہیں۔ کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوے کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علما اور مشائخ اور فصحا اور بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطۂ فارس میں اہل کمال ہو گذرے تھے۔ بزرگوں سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے۔ یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود ان کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اسی لیے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا

سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسۂ عضدیہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا۔ اور اس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے۔ لیکن اس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دل بامروت اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اس کی طبیعت میں۔ اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکرکشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے۔ جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبتِ شیراز بہ کلی بگرفت　　وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حبِّ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح　　نتواں مرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مرا نہیں جاتا

شیخ کے عام حالات

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا اس کے قویٰ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی۔

اس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے۔ بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارہ سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کا کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں۔ اس نے بھی بیت المقدس اور اس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی۔

اس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی۔ مگر آج کل

کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف۔ ایک نہایت بے تکلف کھلا ڈلا یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دور۔ سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا اس نے مثل ظہیر۔ رشید خاقانی اور آنوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ باایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا اس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اس کے قصیدے ایسے ہیں۔ جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اس کی سفارش سے (جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے) غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔

خودداری اور غیرت اس میں ایسی تھی۔ کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اس سے ظہور میں آیا خلقت کی خیرخواہی اور ہمدردی خدا تعالے

نے اس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اس کے نصائح اور مواعظ ہر گز اس قدر مقبول نہ ہوتے۔ اگر انسانی ہمدردی کا جوش اس کے دل میں نہ ہوتا۔ اس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جوہر فطری دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات۔ جو اس کی جلا کے باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اسی کے موافق اس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا۔ جہاں ہونہار بچّوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔

جس مدرسہ میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل علم کے لیے پہونچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا اور جس دارالخلافت[1] میں وہ مدرسہ واقع تھا۔ وہاں کی سوسائٹی اس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شایستہ اور مہذب تھی۔ اس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانہ نے بھی اس

[1] بغداد ۱۲

کی تادیب خاطر خواہ کی تھی اُس کی عمر کا ایک بہت بڑا او رمفید حصہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر کرنے اور دنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے درپے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم وستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اس کی طبیعت میں راسخ ہوگئی تھی۔ بیسیوں خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے۔ ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا۔ کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پہونچ گئے۔

ساتویں صدی میں۔ جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے۔ عجیب وغریب تماشے اُس کی نظر سے گذر گئے سلاطین کردیہ کا خاندان جن کی سطوت وجلالت۔ ایشیا۔ افریقہ ویورپ میں یکساں مانی جاتی تھی۔ اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ قونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کردیا۔ اسی صدی میں ہوئی پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریاے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لیے نیست ونابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون

مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے۔ اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصّاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا۔ دار الملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا۔ اسی صدی میں کئی بار قتل اور غارت کیا گیا۔ فرقۂ اسماعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا۔ ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اس نے عربی میں لکھا ہے۔ اس میں کہتا ہے "خدا حمایت کرے اُس شخص کی۔ جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے"۔ یورپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے۔ کہ "میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دلسوز اُستاد تھے"۔

(حالی)

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

از رویاے صادقہ

ریاضتِ جسمانی

ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں۔ جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر! اُلٹے مضر۔ بداخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی۔ چوسر۔ شطرنج میں غور اور خوض کی عادت۔ تو ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں اُن سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ اس کو پتّوں کی یادداشت اچھی ہے لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا! صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے۔ مگر ایک سیدھا سا مقدمہ اس کے سامنے بیان کرو۔ تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نکمّے۔ موجب تضیع وقت۔ اب مدرسے کے کھیلوں پر نظر کرو۔ تو نری جسمانی ریاضت اور تفریح طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے بس دماغی محنت بہتیری ہو لی اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا

پڑے۔ تو دماغ کہاں تک اس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ تو جس طرح گھوڑا تھان پر بندھے بندھے پڑے موتر نے نکال لاتا۔ اڈی میں بھر جاتا۔ دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا تھوڑی دُور چلنے سے ہانپنے لگتا۔ کوس دو کوس دوڑانا چاہو۔ تو دوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا تو اگر اور کوئی بیماری اس کو نہ بھی ستائے۔ یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں۔ کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔

خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ ہم ہندوستانی گڑئیں کیا مقابلے کریں گے۔ اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی شہر میں آ نکلتے ہیں تو اُن کو دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں! جنگلی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوا اور کچھ میسر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک دیہاتی سوسوا سو مَن کی چوبلدی گاڑی ہانکے لیے چلا جا رہا تھا شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بدکے کہ گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جاتا رہا بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کھسکا۔ گاڑیبان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں نہ دیہاتیوں کا پانی۔ نہ شہریوں کا ماء اللحم۔ نہ ان کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے۔ بیشک شہر اور دیہات کی آب و ہوا میں بھی بہت

بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹھا پن ہے۔ محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب۔ اس پر محنت مشقت ندارد۔ جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں۔ اور بوٹی ہو۔ تو کہاں سے ہو۔ بیچارے کو کبھی کھل کر بھوک نہیں لگتی۔ اور مارے ہو کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے۔ تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں سینہ ابھرا ہوا ہے۔ قینچے چڑھے ہیں۔ دیکھنے کو موٹے تازے۔ داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا ان میں بھی نہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی ہے۔ کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گذاری کے اور کوئی کام نہ تھا نکمے بیٹھے بیٹھے ان کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے۔ کہ ستار بجا رہے ہیں یا بٹیر لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یا اس کی دھن ہے کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے۔ کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور انھوں نے ایسی ایسی جوڑیں تیار کی تھیں۔ کہ جواڑوں میں جا جا کر کشتی مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی کہ ان دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں۔ کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے صاحب عالم اس ایجاد کو سُنکر پھڑک گئے اور فرمایا بھئی واللہ تخت کی قسم ہے! کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا ولایتی کی کشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے

داروغہ جی دینا اِن کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کُشتی کا اہتمام بھی کرنا اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا سرفراز فرمائیں گے۔
نہیں معلوم۔ ظالموں نے کیا تدبیر کی کہ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آدمی کا ہے کو تھا۔ ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بُو آتی تھی۔ ایسی سخت کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جوتیوں سے۔ اُدھر مشکیزہ سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں۔ ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے اس کے گرد اگرد ایسے معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے۔ اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اس پر بندھی ہے کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے کوئی بنیٹی کے کرتب دکھا رہا ہے اتنے میں غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لا کر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا۔ اس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ کہ موت کے منہ میں جائے۔ اور ولائتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گاؤ تکیہ

بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو میٹھا دیکھ رہا ہے۔ اور ان پہلوانوں کو سمجھتا ہے کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں۔

اکھاڑے کا استاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا۔ مگر اس کا بدن ایسا مترب تھا۔ اور اس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے۔ کہ یکایک کوئی اس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا ع

فرہی چیزے دگر۔ آماس چیزے دیگر ست

اس نے چپکے سے صاحب عالم کے پاس جا کر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا۔ اور استاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں لیکن سرکار راجرس کے چاقو کو قصائی کے بغدے سے بھڑاتے ہیں ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا۔ حکم کی تعمیل میں مجال عذر نہیں۔ پچھڑیں گے تو نہیں۔ مگر اس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجیے۔ کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور رہے۔ تو بسم اللہ اس کا دبوچا ہوا آدمی چھٹکا بھی تو نہیں کھانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت!" صاحب عالم سمجھے تو سہی۔ مگر سارے میں غل مچوا چکے تھے۔ کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے!

بارے لوگوں نے ولائتی سے کہا۔ کہ "آغا! ان لوگوں میں سے جسکے ساتھ تمھارا جی چاہے کشتی لڑو۔" آغا "ہم سب کے ساتھ لڑے گا۔"

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا۔ خیر ایک کی دار و دو۔ استاد

اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے سبھی نے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نہ جنبد۔ لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔

اِن لوگوں نے نادانی یہ کی۔ کہ آغا سے گتھ گئے۔ اُس نے موقع پاکر ایک کو تو اس بغل میں دابا۔ اور دوسرے کو دوسری بغل میں اُس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دابا تھا۔ مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کوب لیے پھرتا ہے۔ اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب سُنا اچھا تو ہو گیا ہے۔ مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا۔

خیر بنی آدم میں یہ ولائتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں۔ اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اس کے عقلی دلائل موجود ہیں۔ کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں۔ اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں۔ تو آیندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھہرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لیے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو۔ تو جس قدر برداشت کیجا سکتی ہے وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہے اور پھر ہلدی لگے نہ پھٹکری۔

(نذیر احمد)

عقل کی نا رسائی

(از ابن الوقت)

بلا شبہہ مبداءِ فیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے اور وہی مدارِ تکلیفِ شرع بھی ہے لیکن بیش بریں نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی اجسامِ کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو۔ مثلاً فرض کرو۔ کہ کشتی یا ریل میں ہو۔ تو وہ اُلٹا ٹھیری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھیرا ہوا۔ تیز حرکت متشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں تو جھکی ہوئی دکھائی دے گی شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے۔

غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے۔ اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے وہ بھی نقصان سے بری نہیں۔ اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لیے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے ہندسہ کے علاوہ جسکے اصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر فلسفی۔ جج۔ ایسٹرانومرز[1] (ہیأت داں)

---

[1] ایس ٹران مر = واحد = ز علامت جمع۔

پالٹیشنرز٭ (مدبران ملک) اہل مذاہب وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں منطق کے قاعدے منضبط ہوئے۔ مناظرے کے اصول ٹھیرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تاقیامت کم ہو۔ جب ہست ونیست کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک بر سر غلط ہے۔

اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے مگر ہم ذرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اس کو عام بھی کر دیتا تو اتنا فائدہ نہ پہونچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز٭٭ یعنے زمانہ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس الامری میں غور وخوض کرنے کی دھن لگا دی ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مشکور وکامیاب کرتا ہے۔ بحر بے پایاں موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں اور معلومات جدیدکے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں ان ماڈرن ڈسکوریز میں سے (زیادہ نہیں) صرف ایک چیز عام فہم ہے جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ریل

اب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں نہیں معلوم ہوئی۔ اور یہی سوال ہر

٭ پالی ٹی شِ ین، واحد۔ ز علامت جمع ۱۲ ٭٭ ڈس کَ وَ ری۔ واحد۔ ز علامت جمع ۱۲

دُس کوری کی بابت ہو سکتا ہے جواب تک ہوئی یا آیندہ کسی وقت میں ہو۔
سر اسحق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا۔ کہتا تھا
کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے
ہیں۔ اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچّوں کی طرح سیپیاں اور
گھونگے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا اُس شخص کا جس نے زمین اور
آسمان کے قُلاّبے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج
سارا یورپ اس کے نام پر فخر کرتا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی ہے
وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے
زمانے کے انگریزی خواں ہیں۔ کہ سیدھی سی اقلیدس کی نئی شکل پوچھو
تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ۔ کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ پس
جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا قصور ہے کہ
کھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس
پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آ سکتی تھی۔ کہ مہینوں کی مسافت ہم
گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزار ہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم
کر لیا کریں گے۔ یا آگ سے برف جمائیں گے یا کپڑے کی کل میں
کپاس بھر کر اچھے خاصے ڈھلے ڈھلائے تہ کیے ہوئے تھان نکال لیا
کرینگے۔ اور ابھی کیا معلوم۔ کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہینگے
آدمی۔ عاجز ناچیز بے حقیقت۔

بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کریگا۔ جب کہ اس کو پاس کے پاس اتنا

تو معلوم ہی نہیں۔ کہ روح کیا چیز ہے۔ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ وقت کے ازلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گذرے ہیں۔ کہ اس سرے سے اس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا۔ اور مر گئے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی؟ جو اُن میں سے نکل گئی۔ حیوانات۔ نباتات۔ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکّر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور کس غرض سے ہو رہا ہے!

(نذیر احمد)

کارخانۂ قدرت

(از ابن الوقت)

کسی کتاب میں نظر سے گذرا۔ کہ زمانہ حال کا کوئی فلسفی خردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سَو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہو گی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد

۵۴ میل کے دَل کا ہوائی کرہ ہے اور اس میں بھی جان داروں کی (ایسی ہی یا اِس سے زیادہ) کثرت ہے۔

ہر چند کارخانہ قدرت الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا۔ جس کو میں دین داری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں + اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ با ایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے؟ اور کیوں؟ اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیسا! سکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔

یہاں روے زمین پر ایک بھنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل۔ ایک پنکھڑی۔ گھاس کے ایک ڈنٹھل چھوٹی سے چھوٹی اور ادنی سے ادنی چیز

کو بھی نظر غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود ہے مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھنسیں اُس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے اس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لیے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوہان کا گودام ہے کہ اگر اُس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل ماتیحلل کا کام دے + ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں + ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے + پرندوں کے جثے سبک ہیں۔ تاکہ ہوا میں اڑ سکیں + دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت ان کی غذا کے مناسب ہیں + نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرد ملک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا

نہ کھائیں + جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں۔ اُن میں توالد و تناسل کی کثرت ہے۔ تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے + آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہونچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور اون۔ اس قسم کے سامان قدرتی اُس کو نہیں دیے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے۔ وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اس کا ایک ایک رُواں صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پرزہ ہاتھ ہے کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں (اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو ان تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے) سب اسی پُرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شد و مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بگیوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پرزے ہزارہا پیچ۔ بیلن۔ پہیے۔ چرخیاں۔ کمانیاں خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کیے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لیے کل بنائی گئی ہے یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی

بنائی ہوئی ہے۔یہی آدمی کا ہاتھ۔کہ ہزار ہا قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلاح!

انسان کے بدن میں ایک اور ذرے بھر کی چیز آنکھ ہے۔اس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے جس میں نگینہ کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔اوپر بھوں کا چھجے دار سائبان۔سامنے پپوٹوں کا پردہ۔پردے میں پلکوں کی جھالر پھر پپوٹے کے اندر منافذ ہیں۔جن میں سے آئینہ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے۔یہ وہی رطوبت ہے۔جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔گویا اتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھرتا ہے۔گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔جس کے یہ معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے۔

میرا تو کیا منہ ہے۔کہ موجودات عالم میں جو اسرار حکمت مضمر ہیں ان کا ایک شمہ بھی بیان کر سکوں۔مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کارخانے کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے۔کل میں نے آیت اللہ کا سبق سُنا۔وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے۔کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اُردو میں ترجمہ کر دیے ہیں۔اسی میں

لکھا تھا۔ کہ مچھّر کے منہ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے وہ حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اُس نلوے میں تین اوزار۔ ایک تو سُوئی جس کو مچھّر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے۔ اس میں اتنی بات اور بھی تھی۔ کہ اس شکل خاص میں مچھّر کی مدت حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں! ۔ اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سُنے۔ جیسی کہ اس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرہ اِس بات کی گواہی دے گا۔ کہ اس کو کسی بڑے قدرت والے دانش مند۔ ہمہ دان۔ حاضر۔ ناظر۔ سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ انسان صمیم قلب سے موجودات عالم میں غور اور خوض کرے۔ اور اس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور انضباط کا کیا مذکور! اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا؟ کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اس میں رتی برابر فرق پڑا نہیں۔

نذیر احمد

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی

از سفرنامہ

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ۔ جو دور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اُس کے دو کناروں پر آباد ہے۔ اور اس وجہ سے اس کے دو حصّے بنگئے ہیں۔ ایک حِصّہ **استنبول** کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے۔ سلاطین کے مقبرے اسی حِصّہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔ دوسرا حِصّہ **پیرہ** سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے انتہائی جانب پر **بشکطاش** وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں سلطان کا ایوان شاہی اور قصر عدالت ہے پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے۔ اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں۔ اس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ دنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے۔ کہ منظر کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوش نما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا۔ اسی لحاظ سے اس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی سنہری سینگ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے

آگے جو زمین ہے۔ وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اسکی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے۔ اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے۔

شہر کی وسعت تمدن کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانسو جامع مسجدیں۔ ایک سو اکھتر حمام۔ تین سو چونتیس سرائیں ایک سو چونسٹھ مدارس قدیم۔ پانسو مدارس جدید۔ بارہ کالج۔ پینتالیس کتب خانے۔ تین سو پانچ خانقاہیں۔ اڑتالیس چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں بارہ دخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں۔ جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پل ہے۔ اس پر سے گذرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں۔ جنکی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے و قہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں۔ جنکے لیے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں

اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں قسطنطنیہ بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سُنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں۔ تو تعجب سے کہتے تھے "وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں"۔ ان ملکوں میں دوستوں سے ملنے جلنے اور گرمی صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ اس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ میں دو بڑے نقص ہیں۔ اول تو تفریح کے جلسے پرفضا مقامات میں ہونے چاہییں۔ کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کو فائدہ پہونچے دوسرے سخت خرابی یہ ہے۔ چونکہ یہ جلسے پرائوٹ جلسے ہوتے ہیں اس لیے ان میں غیبت۔ شکایت اور اس قسم کی لغویات کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمع عام کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس قسم کے تذکرے نہیں سنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو۔ تو یہاں دیکھ سکتا ہے کتب فروشوں کی دکانوں کی سیر کرو۔ تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے۔ سنگ رخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتابیں جس قدر ہیں۔ مجلد۔ اور جلدیں بھی معمولی نہیں۔ بلکہ عموماً مطلا و مذہب۔ مالک دکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم سن خوش لباس لڑکے اِدھر اُدھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دکان میں قدم رکھا۔ ایک لڑکے نے کرسی لاکر سامنے رکھ دی۔ اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے۔ اور اسمیں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔ زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ قیمت چکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے۔

اسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دکانیں۔ دونوں نمونہ کی موجود ہیں عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔ **غلطہ** کو دیکھو۔ تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دکانیں بلند اور آراستہ۔ سڑکیں وسیع اور ہموار۔ کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اسکے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل۔

اِس شہر میں آکر ایک سیاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اس عظیم الشان دار السلطنت کے دو حصّوں میں اس قدر اختلاف حالت کیوں ہے؟ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا میں نے اس کے متعلق کچھ بحث و تفتیش کی۔ باشندوں کے اختلاف حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کر لیا۔ یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا تموّل لیکن سڑکوں اور گزرگاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر سبب قرار نہیں پا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنی حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ "ہماری مینوسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس لیے مینوسپلٹی ان رقموں کو فیاضی سے صرف کر سکتی ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے یا اب ان کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے کہ اس کے لیے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے۔

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ۔ چہار منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں

تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے امرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا۔ کہ دو چار گھر آگ سے جلکر تباہ نہوں۔ اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لیے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں ایک نہایت بلند مُنارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں۔ فوراً خبر کریں۔ اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے مُنارے جا بجا بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سر ہوتی ہیں۔ اور شہر کے ہر حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہونچ جاتے ہیں۔ اُنکو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُن کی جھپیٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پہونچتا ہے۔

آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا۔ اس قدر خوش گوار ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امرا شملہ اور نینی تال کی بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے! پانی پہاڑ سے آتا ہے۔ اور نہایت ہاضم اور

خوش گوار ہے۔

(دہلی ہمالی)

مصر کی قدیم یادگاریں

آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سوادِ شہر کے ویرانوں میں اس وقت تک سیکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں جن پر کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجکو اتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور انھیں کے حال کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اَہرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں۔ جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے۔ کہ یونان کی علمی ترقی سے ان کی عمر زیادہ ہے۔ کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار نہایت کثرت سے تھے یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیے گئے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں۔ اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اطلاق ہوتا ہے صرف تین ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے اس کی لمبائی چار سو اسی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دُگنی ہے۔ نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع سات سو چونسٹھ فیٹ ہے۔ مینار کا مکعب

آٹھ کرور نوے لاکھ فیٹ ہے۔ اور وزن اڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے۔ جڑ میں تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتھر کی چٹانیں ہیں۔ اور چوٹی پر جو چھوٹی سی چھوٹی ہیں آٹھ فیٹ کی ہیں۔

اس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے اس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ تعجب یہ ہے۔ کہ پتھروں کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا دراز کا معلوم ہونا تو ایک طرف چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر استحکام کا یہ حال ہے۔ کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے۔

ان میناروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ جرِ ثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔ کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جرِ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے۔ اور اگر اس ایجاد کو زمانہ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں۔ تو جرِ ثقیل سے بھی بڑھ کر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

ان میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے کسی قدر خراب ہو گیا ہے جس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ ۵۹۳ھ ہجری میں ملک العزیز

(پسر سلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اس کو ڈھانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے برباد کر دیے گئے لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب ہوئی۔ یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اُکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

اہرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے۔ جسکو یہاں کے لوگ **ابوالہول** کہتے ہیں۔ اس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن ملا ہے جس کی آب اس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہوگا۔ باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں۔ کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا۔ کہ "آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی؟" اس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب"، کیونکہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں۔ اس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں۔

(شبلی نعمانی)

مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی

بزم قدرت

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل جسمیں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ آباد رہی اور یونھیں قیامت تک جمی رہیگی۔ یہ وہ محفل ہے جسکی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پرغم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جنسے ہماری محفلیں درہم و برہم ہوجایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزم قدرت کی رونق اور دوبالا ہوجاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلائے دشت غربت ہوجاتا ہے۔ تو برسوں ہماری انجمنیں سونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذر اجل ہوجاتا ہے تو سالہا سال کے لیے وہ ماتم کدے ہوجاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو تو اس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پرجوش زندہ دل ایسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کرجاتی ہیں ایک شاعر کا قول ہے

دنیا کے جو مزے ہیں۔ ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے۔ افسوس! ہم نہ ہوں گے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزم قدرت ہمیشہ یونہیں دلچسپیوں سے آباد رہیگی۔ ہاں ہم نہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لا کے بٹھا دے گا

کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگیں گی۔
الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا۔ جو اس بزم کی رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے کہ زمانہ کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ اور ملک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ اور ان کو دعوے ہوتا ہے کہ زمانہ تنزل پر ہے مگر اصل پوچھیے تو تنزل صرف ان کی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے دنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جا رہی ہے
اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزران رہے ہو ذرا بزم قدرت کو دیکھو تو کس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمھارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا۔ کہ ان چیزوں کی قدر کر سکو یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں۔ اور طبیعت میں وہ مفید حوصلے پیدا کرتی ہیں۔ جنسے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہوں گے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے تارے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دکھا رہے ہیں دیکھو ان پیارے خوش نما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی تری و تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ ماہتاب آسمان کے نیلگوں طلسمی

دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لے کے آیا تھا لیکن خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کر کے بزم قدرت میں نہایت لطیف اور خوش گوار دل چسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحن فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہو گیا۔ ابھی آسمان کو اس مہمان کا انتظار تھا جس سے نظام عالم کا سارا کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب و تاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اُترے ہوئے چہرہ کو چھپا کے غائب ہو گیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزم قدرت کے دلفریب **ایکٹروں** سے خالی ہو گیا۔

خواب شب کا مزا اٹھانے والوں کی آنکھیں کھل کھل کے افق مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسکے ساتھ مرغان سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور آنکھیں ملکے دیکھا ہے۔ تو ہماری نظر کی خیرگی نہ تھی۔ شمع حقیقت میں جھلملا رہی ہے یک بیک وفور طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے گھنٹے بجے۔ چڑیاں چہچہائیں۔ موذنوں نے اذانیں دیں۔ اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے ملکر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہو گئی باغ نیچر کے چابکدست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسیم سحر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابط و متین غنچوں کے پہلو گدگدانے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔

(عبد الحلیم شررؔ)

خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات

شاید کوئی اور دوسرا مدبر و منتظم ملکی ایسا گزرا ہو کہ جس کی تفضیح اور ہجو اس مبالغہ سے اور تعریف اس شد و مد سے ہوئی ہو۔ اور اس کی ساری زندگی کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری سے ہوئی ہو۔ مگر اس کی نسبت لکھنے والے طرف دار اور متعصب تھے۔ اگر نظر انصاف سے دیکھیے۔ تو اس میں یہ بھلائیاں اور برائیاں معلوم ہوں گی۔ جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اُس کی فطانت اور فراست و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اس میں شبہہ نہیں کرتا کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا کہ امور خطیر اور معاملات عظیم کے انصرام اور سرانجام کرنے کی اس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ برسوں تک اس نے ایک سلطنت بزرگ اور مملکت عظیم کا نظم و نسق کیا۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش بڑے درجے کا تھا۔ کاہلی اس سے کروڑوں کوس دور رہتی تھی اس کے جانشین جو ہوئے اُن میں دو چار قابلیت اور لیاقت میں تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت و مشقت و کارگزاری میں کہیں اس سے ہلکے تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا۔ جس نے یہ سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے علیحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے لیے ضرور ہے کہ

وہ اور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے یہی باب فتح و نصرت کی کنجی ہے۔ یہی وہ روشن عقل تھا کہ اس شاہراہ پر انگریزی گورنمنٹ کو رستہ دکھایا جس پر چلنے سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی گو یہ خیالات اس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے۔ مگر بڑی بھلی طرح سے تجربہ ہو کر آخر کار وہی صحیح ثابت ہو گئے۔

اُس نے انگریزی صوبوں کے حسن انتظام میں اپنی عقل و ذہن کو بہت خرچ کیا۔ انقلابوں کے طوفان نے سارے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمع افسردہ کی طرح سب میں دھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت برا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں حقیقت میں اُن کے طفیل وہ ظلم و ستم ہوتے تھے کہ قلم لکھ نہیں سکتا۔ اگر زمیندار تھا۔ تو ادائے مالگذاری کے لیے سراس کا گنجہ بنایا جاتا تھا۔ اگر ساہوکار تھا۔ تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا غرض سارے زمانے کی عافیت تنگ تھی۔ اس نے ان سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو ان کو اس نے درجۂ کمال پر نہیں پہونچایا اور نہ ان کو اچھا بنایا۔ مگر وہ ایک بنیاد ان کی ایسی ڈال گیا۔ کہ پھر اس پر اَوروں کو ردّے لگا کر عمارت بنانی آسان ہو گئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا۔ کہ جس کی طرف اس نے توجہ نہ کی ہو۔ اور اُن میں بہت سی باتوں کا موجد نہ ہو۔

اُس نے اپنی سرکار کی ہوا خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں
کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اس کے سرانجام کرنے میں
کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا ازراہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا
اہل انگلستان نے اس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اس کی طبیعت کا خمیر ایسا
تھا۔ کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا
اور مروت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت
بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب برخود غلط اتنا تھا۔ کہ
اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اس کا
ایک راز سربستہ اور سرپوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھلنے
ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہو۔ وجہ اس کی
یہ تھی۔ کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اس میں جو
خوبیاں تھیں۔ وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو بُرائیاں تھیں۔ وہ نفرین
کے لائق۔ یوں سمجھنا چاہیے۔ کہ رعایا پروری۔ سپاہ کی دلداری۔ لوگوں
کو اپنا کر لینا رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال یہ سب خوبیاں اس
میں ایسی تھیں۔ کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوش نما معلوم ہوتی
تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اس کی گنجینۂ آمائی
دولت افزائی ایسی ایک بلی اس میں تھی۔ کہ وہ اس طوطی خوش رنگ
کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلی کے بھنبوڑنے کے لیے اس کے پاس
ایک کتا بھی موجود تھا۔ جو اس کی خود پرستی و خود رائی تھی

غرض یہ فضائل اور رذائل اس میں کام کر رہے تھے۔ جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلی اور کتا کام کریں ہیسٹنگز صاحب کی سب سے زیادہ تعریف اس بات میں تھی۔ کہ اس نے سارے کارخانوں اور کاموں کے لیے خود ہی مقدمات کو ترتیب دیا اور اس بات کو سرانجام کیا جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا۔ تو طفل مکتب تھا۔ نوکری ملی تو تجارت کے کارخانے میں کبھی اس کو اہل علم اور منتظمان ملکی کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی۔ جتنے اس کے یہاں جلیس وانیس تھے ان میں کوئی اس سے زیادہ صاحب لیاقت نہ تھا۔ کہ اس کی لیاقت کو بڑھاتا بلکہ اُس کو خود اُستاد بنکر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ سب کا رہنما تھا اور اس کا رہنما فقط اس کی عقل و دانش کا نُور تھا۔

(محمد ذکاءاللہ)

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضت محمودہ اور کوشش وسعی کے ہیں جس سے کسب وفضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا۔ کہ بے ادب اُسے دیکھکر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے۔ وہ اور

آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے۔ اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔
تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا ساخندہ کر۔ کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں۔ وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے۔ اگر تمھاری داڑھی کوؤں کے پروں کی سی سیاہ ہو تو بڈھوں کی بگلا سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا۔ کہ "میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لیے زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لیے۔ ایک عیب ہے" تجھے چاہیے کہ جو تیرا عیب بیں ہو۔ تو اُس کا ہنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے۔ تو اس کو نبات دے۔ جو تجھے مارے۔ تو اسے آب حیات پلا۔ تاکہ تیری عقل سلامت پسند ہو۔ اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں آواز بلند پڑھا جائے۔ خدا سے توفیق ادب کی دعا مانگ۔ کیونکہ ادب کے بغیر لطف رب سے آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لیے برا نہیں ہوتا۔ بلکہ اوروں کے لیے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے۔ گستاخی اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے۔

(محمد ذکاء اللہ)

حیا

"حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے اور بیحیائی بھی قسم قسم کی سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبت میں اندھا ہونا ہے جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ ایک شخص جو سرشت انسانی سے بڑا ماہر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ "آدمی اپنے سے سب کے بعد محبت کرے" مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ان صفات کا یقین کرتے ہیں جو درحقیقت ان میں نہیں ہوتیں۔ اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ یہی سخت عیب ہے۔ جس سے انسان جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے۔ اور ذلت اٹھاتا ہے۔ خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ جب آدمی خودستائی کرتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے۔ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ کوئی بڑی قابلیت و قدر و منزلت کا آدمی ہے۔ تو ضرور اس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے۔ تو اس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور عجز و انکسار اختیار کرنا چاہیئے جب آدمی اپنی نیک صفات کو۔ جو حقیقت میں اسکے اندر ہیں نمود کے ساتھ دکھلائے گا۔ تو شیخی کرکری ہو جائیگی۔

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ مغرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ مغرور اپنی نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عبث کرتا ہے۔ وہ اپنے دُگنے

زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھوکوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اور اس کے تمام زور کو اپنے سے دور کردیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی فروتن۔ متواضع۔ منکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر سے ٹال دیتا ہے۔

سفلے کم ظرف ناشایستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں سچے مہذّب اور شایستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی سی لیاقت رکھتے ہیں۔ وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں وہ اپنے میں یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ۔ کیا نہیں جانتے جتنا اُن کا علم بڑھتا ہے۔ اتنا ہی اپنی جہالت کے علم سے ان کی حیا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں ایک عمق کے بعد دوسرا عمق اُنکے آگے ہوتا ہے۔ اس کی تھاہ کبھی اُن کو نہیں ملتی۔ یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں۔ کہ جلدی سے تھاہ کو پاکے خوش ہوجاتے ہیں اور اس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔ عالموں کی نظروں کے روبرو۔ پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے جس سے ان کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے۔ جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے اتنی ہی اُن کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے۔

(محمد ذکاء اللہ)

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے
خواہ وہ کسی جماعت کا ہو۔ جو شریف شرافت نسبی اور شرافت حقیقی
تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے۔ وہ اپنے دل سے اس امر کو
اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے۔ کہ بہبود عوام اور رفاہ انام میں سعی کرکے
محنت میں اپنا حصہ لوں۔ اس کو ہرگز یہ گوارا سے خاطر نہیں ہوتا کہ
میں اَوروں کی محنت سے کھاؤں پیوں۔ میں فراغت سے رہوں اور
اِس کا معاوضہ خود محنت کرکے اپنی سوسائٹی کو نہ دوں۔
عالی خیال نیک کردار اس تصور سے بھاگتا ہے کہ یونہیں بیٹھا رہے
اور دعوتیں اڑایا کرے اور اس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔ نکما پن اور
سُستی نہ کوئی عزت ہے۔ نہ کوئی منفعت ہے۔ اس سے فرومایہ اور
کمینہ طبائع راضی ہو جاویں۔ مگر عالی ہمت تو ایسی حالت کو ذلت
سمجھتے ہیں۔ اور حقیقی عزت اور عظمت سے اسے بعید جانتے ہیں۔
ایک دانشمند بلند خرد جو خود جد و جہد میں مجتہد تھا۔ وہ اپنے بیٹے
کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ یہ پند سودمند ارقام فرماتا ہے کہ
"اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدت سے
زور دے کر نہیں جما سکتا۔ کہ ہر امیر۔ شریف غریب۔ فقیر کی شرط زندگی
محنت ہے۔ غریب کسان روٹی اپنی پیشانی کی عرق ریزی سے کماتا
ہے۔ اور امیر اپنے شکار کی جستجو میں سعی کرکے اپنی سُستی کو کھوتا ہے

جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر ہل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں لگتا۔ ایسے ہی مزرعۂ دل میں تخم علم بغیر محنت کے بار آور نہیں ہوتا۔ مگر ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ ایسے اتفاقات اور وقعات پیش آسکتے ہیں۔ کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اس کی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اس سے متمتع ہو۔ مگر علم میں یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ آتش زدگی یا وقوع حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعہ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہوجائے اور یہ ثمر دوسرے کو ملجائے۔ اس کے تحصیل علم کی تکمیل اور توسیع خاص اسی کی ذاتی منفعت کے لیے ہے اسی واسطے میرے پیارے بچے! محنت کر اور وقت کو اچھی طرح کام میں لا"۔ لڑکپن میں ہمارے قد ہلکے ہوتے ہیں اور دل ملائم۔ اس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے۔ آدمی کی بھی عمریں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں کہ اگر ایک فصل کی کاشت میں غفلت کیجیے۔ تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ پس اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خریف و ربیع کی فصلیں ہیں۔ ضائع کردیں گے۔ تو بڑھاپا ہمارا۔ کہ کھرسا کا موسم ہے نہایت خوار اور ذلیل ہو گا۔

(محمد ذکاء اللہ)

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

محمد حسین نام۔ آزاد تخلص۔ دہلوی۔ فن شعر میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد علوم عربیہ و فارسیہ میں خطّ وافی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ اُردو میں ان کی نثر پایۂ عالی رکھتی ہے۔ تشبیہ و تمثیل کا استعمال نہایت خوبی و لطافت سے کرتے ہیں۔

اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں۔ تو گویا وہ ایک اوزار ہے۔ کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچّے نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ وہی اس سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کردے۔ جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے۔ تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے۔ جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے۔ ان سے حاصل کر لیتا ہے وہ ایک نادر مرصّع کار ہے۔ کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیار ہے۔ جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے

قفل کھولتا اور بند کرتا ہے یا مصوّر ہے۔ کہ نظر کے میدان میں مرقع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اسے پھول۔ گل۔ طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔

اس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوش نما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے۔ بھرے اس کے کہ بوند پانی آہیں ڈالے۔ ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سرتاپا عالم نیرنگ۔

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گذر گئے ہیں جن کے مرقعے آجتک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آجکل گویا انکے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول ان کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اول

یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں۔ مگر ناتمام ہیں۔ اور اسکے سبب ظاہر ہیں۔

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ تم جانتے ہو۔ کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اس کی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام اُردو خود کہتا ہے۔ کہ میں علمی نہیں۔ بازار کی زبان ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے۔ لین دین کی باتوں کے لیے کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہو اور انگریزی اقبال کے ساتھ ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا مگر سوا چند دیوانوں کے اس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ ان کی فرمایش سے کئی کتابیں۔ کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور انھی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اردو ہونے شروع ہوئے ۱۸۳۶ء میں ایک اردو اخبار جاری ہوا ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے براے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل ستر بہتر برس کی

ہو۔ اس کی بساط کیا۔ اور اس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔
پس اس وقت ہمیں اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہیے۔
میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بیجا ہے۔
عربی بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ وغیرہ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل ملک میں علم آتا ہے پھر علمی اشیاء کے لیے الفاظ یا تو اس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہوجاتے ہیں۔
علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اول خاص وعام میں علم پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں مثلاً ریل کا انجن اور اس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادنےٰ ادنےٰ

ناخواندے سب جان گئے اگر بے اس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈھتے یا پہلے یاد کراتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا یہی نام لیں۔ خواہ فانوس جادو کہیں خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر مشاہدے میں عام ہو جائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے۔ تو الٹے سے الٹا اس کا نام رکھ دیں۔ وہی بچے بچے کی زبان پر مشہور ہو جائے گا۔ اور وہی سب سمجھیں گے۔

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا ایلکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں اس لیے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں۔ کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے۔ تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے۔ تو اہل ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اس سے آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہوں گے۔ تو ان کے الفاظ بھی ہوں گے ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا۔

(محمد حسین آزاد)

تذکرۂ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا۔ کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا۔ کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا۔ وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستاں رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لیے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں ؟ جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغبالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔

کیسا مبارک زمانہ ہوگا جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والدِ مغفور ہم عمر ہونگے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفلی میں ہوگی صرف ونحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک استاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہونگے۔ ان نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا۔ کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو۔ کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پرزے کو کہہ سکتے ہیں! کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی۔ اس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کردیا تھا۔ کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تواریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علیخاں نے

انھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے کہ سنہ ۱۲۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہو گی۔ کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے۔ تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلہ کے اکثر لڑکے انھیں کے پاس پڑھتے تھے انھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے محلّہ کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہلوا جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت انکے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے۔ کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا۔ اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا۔ کہ الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایکدن خوشی میں آکر خودبخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسن اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا۔ کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو۔ اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال،

سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں۔ کہیں جابجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا۔ اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا غرض کہ اسی عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی برق سے تھے اور کبھی بادوباراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دَوڑاتے تھے۔

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور انکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

سِلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ واطبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک

جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے۔ استاد شاگردوں کو چمکانے لگا
بعض موقع پر ایسا ہوا۔ کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھکر
بے اصلاح پھیر دیا اور کہا۔ کہ "طبیعت پر زور ڈال کر کہو" کبھی کہدیا
یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو بعض غزلوں کو جو اصلاح دی۔ اس سے
بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکادیا۔ کچھ اپنی غریب
حالت نے یہ آزردگی پیدا کی۔ کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی
یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھریں بہت سے
شعر کٹ گئے زیادہ تر قباحت یہ ہوئی۔ کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے
شاہ وجیہ الدین منیرؔ تھے۔ جو برّاقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید
تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے۔ یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی
مضمون پائے گئے۔ اس لیے انھیں زیادہ رنج ہوا۔

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر۔ فکر رسا۔ بندش چُست۔ اس پر کلام میں
زور سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا
کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیے
رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک
دن سوداؔ کی غزل پر غزل کہی " دوش نقش پا۔ آغوش نقش پا" شاہ صاحب
کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی۔ کہ استاد کی
غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ ان
دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کرکے گھر سے

نکالا مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اس دن سے جراُت زیادہ ہوئی۔ اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگان پاک طینت جو اساتذہ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولیعہد۔ کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہیں آ کر جمع ہوتے تھے اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہونچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ دکن چلے گئے میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کے لیے ولیعہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ ان دنوں میں مختار کل تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو۔ اس کو سامنے سے سرکاتے رہیں اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسان حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ "میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو" غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینہ بھی ہوگیا۔

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ کہکر اکبر شاہ کے دربار

میں سنایا جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کیے تھے۔ مطلع اس کا یہ ہے!

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے "خاقانی ہند" کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

اواخر ایام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدۂ غرا کہکر نذر گزرانا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے!

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴ صفر ۱۲۷۱ ہجری جمعرات کا دن تھا ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(محمد حسین آزاد)

مرزا اسداللہ خاں غالب

اسداللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ عرف۔ چندے اسد پھر غالب تخلص کیا۔ سرکار شاہی سے نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا۔ سرکار انگریزی سے پنشن پاتے تھے۔ اکبر آباد مولد و دہلی مسکن سنہ ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال راہی ملک بقا ہوے۔ ان کا کلام زیادہ تر فارسی ہے اردو میں ایک مختصر دیوان اور ایک مجموعہ رقعات ہے۔ اُس زمانہ میں مقفیٰ نویسی کی وبا عام ہو رہی تھی مرزا نے بھی اس کی رعایت کی۔ مگر محاورہ کو اندھا کانا نہیں بننے دیا۔ اسکے علاوہ لمبے چوڑے القاب و آداب اور تکلفات لایعنی سے انشاے اُردو کو پاک کیا وہ اپنے رقعات کی نسبت خود فرماتے ہیں "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"

خط۔ ۱

برخوردار! تمھارا خط پہونچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہونچا امیر بن گیا اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ اُردو کا دیوان غاصب نا انصاف سے ہاتھ آگیا۔ اور میں نے نورچشم منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہوگے ایک نسخہ تم کو پہونچ جائے گا۔

طریقہ سعادت مندی یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ۔ وہاں سے خط لکھتے رہو۔ اور اپنے مسکن کا پتا ظاہر کرتے رہو ہم تم سے رضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی شرمندہ

بھی ہیں۔

راقم اسد اللہ خاں

مرقومۂ شنبہ روز عید مطابق ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۰ء

خط ۲

اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے! کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پائچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوبرو ہے۔ بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دیدیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا۔

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۹ ماہ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء

(غالب)

خط ۳

او میاں سید زادۂ آزادہ! دلّی کے عاشق دلدادہ! اردو بازار کے رہنے والے! حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے! نہ دل میں مہر و آزرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی۔ نہ سخندانی۔ کس برتے پر تتاپانی

ہائے دِلّی! وائے دِلّی! بھاڑ میں جائے دِلّی! سُنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں۔ ولد مصاحب خاں اس شخص کا حال ازروئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے! معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ عمر کیا ہے۔ لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! لکھ اور جلد لکھ۔

(غالب)

خط۔ ۴

بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا۔ کہ نہ لٹتا؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مُسوّدات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سُو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی۔ نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے۔ اور وہ نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی ستائش میں

اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی
نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ
کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اسکے سوا
اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے
مشتاق ہیں۔ تو نسخہ موسوم بہ دستنبو مطبع مفید خلائق آگرہ سے منگا لیں۔

(غالب)

خط۔ ۵

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب کا
سلام۔ نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو
خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو
باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں
بولتے ہیں۔ کہ ہتھنی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں ورنہ ستم و ظلم و بیداد
مذکر اور جفا مؤنث ہے بے شبہ و شک والسلام

(غالب)

خط۔ ۶

بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے
پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی
قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:۔

مضمحل ہو گئے قوے غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں سب دوستوں کو جنسے خط و کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ ان میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں۔ اُن سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوتا ہے۔ پارسی مکتوبوں۔ رسالوں۔ نسخوں اور کتابوں کے مجموعے شیرازہ بستہ ہو کر اطراف و اقصاے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔ جاں کنی کے خیالات نے مجکو ان کی تحریر سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں انھیں کو جناب احدیت جلت عظمتہٗ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائے۔ میں اب انتہاے عمر ناپائدار کو پہونچکر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا۔ تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہیگا۔ پس امیدوار ہوں۔ کہ آپ انھیں نذور محقرہ یعنے تحریرات روزمرہ اردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش و فرو ماندۂ کشاکش

معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ الغرض ماسوائے ہوس تعقید معنوی کو حضور خود جانتے ہونگے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہذا خامہ فرسائی بروئے کار نہیں آئی۔

(غالب)

خط۔ ۷

سُبحان اللہ! سرآغاز فصل میں ایسے ثمرہائے بیش رس کا پہونچنا نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر ربّ النوع اثمار ہے اس کی تعریف کیا کروں۔ کلام اس باب میں کیا چاہتا ہوں۔ کہیں یاد رہا اور ابدا کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو با ایں ہمہ رواں پروری و کرم گستری و یادآوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت کہار پہونچا اور اسی وقت جواب لے کر اور آم کے دو ٹوکرے دیکر روانہ ہو گیا یہاں سے اس کو حسب الحکم کچھ نہیں دیا گیا۔

(غالب)

خط۔ ۸

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہونچے۔ مکرمی مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں پھوڑا پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ! ضعف کیونکر نہ ہو! برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی

عمر۔ جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہوکر نکل گیا
سن کہاں؟ جواب پھر تولید دم صالح ہو۔ بہرحال زندہ ہوں
اور ناتواں اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنونِ احسان
والسّلام مع الاکرام۔

(غالب)

خط۔ ۹

پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار۔ گویا اس در کا فقیر تکیہ دار
ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں اور بریلی
کہاں! ۱۳۔ اکتوبر کو یہاں پہونچا۔ بشرطِ حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤں گا
نمایش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمایش گاہ کی سیر سے
جس کو دنیا کہتے ہیں۔ دل بھر گیا۔ اب عالمِ بیرنگی کا مشتاق ہوں
لا الہ الا اللہ۔ لاموجود الا اللہ۔ لاموثر فی الوجود الا اللہ۔

(غالب)

خط ۱۰

قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک
ہفتہ گذرا ہوگا۔ کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا۔ کہ آپ کو اس کی
اطلاع دوں۔ خانہ کاہلی خراب! آج لکھوں۔ کل لکھوں۔ اب کون
لکھے! کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی۔ غالب! اس وقت نہ لکھ سہ پہر
کو لکھیو۔ آج دوشنبہ ۲۳۔ جولائی کی بارہ پر دو بجے ہرکارہ نے

آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا۔ مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفٰے خاں حسرتی کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں نشائے اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے "کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہونچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام" یہ تحریر اس ہفتہ میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے! بالیقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کرینگے۔ کتاب کے باب میں سرمد کی رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے:۔

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست　مے باید دید و دم نمے باید زد

بوستان خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار معرض طبع میں ہے اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو۔ تو جتنے مجلد فرمائیے اس قدر بھجوا دوں۔ چھ روپیہ مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اسی مطبع میں جس میں حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھپا پا جاتا ہے۔ اب کے ہفتہ کو دو ورقہ بھیجدوں گا۔ بشرط پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجے گا جناب کیمسن صاحب افسر مدارس غرب وشمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا اُس کا

جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اُردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیجدیا۔ نثر کے باب میں
تمھارا نام نہیں لکھا۔ مگر یہ لکھا۔ کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے
بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیجدوں گا۔ زیادہ حد ادب
نامۂ جواب طلب۔

غالب

خط ۱۱

قبلہ! پیری و صد عیب۔ ساتویں دہائی کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج
آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار
فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے
ہوتے۔ اگر مفقود نہ کہو۔ تو بمنزلۂ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا ایک
حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ
جُرعہ جُرعہ پیتا ہوں۔ مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا۔ کہ کتنا
پانی پی جاتا ہوں۔ میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستان خیال کا
اُردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ
اس کا نہ بصورت پارسل بلکہ بلف خط ہذا بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ
ہے سو نقل کر لیجیے۔ میرا مدعا اس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے
اگر آپ کی پسند آئے یا اور اشخاص خریدنا چاہیں۔ تو چھ روپیہ قیمت
اور محصول ذمّہ خریدار ہے۔

(غالب)

از مؤلف

جنگ مرہٹہ و دُرّانی

احمد شاہ والی کابل ہندوستان پر تین حملے کر چکا تھا او صوبہ پنجاب کو ممالک محروسہ میں شامل کر کے نجیب الدولہ رُہیلہ کو شاہ دہلی کی امداد کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ مگر مغلیہ امرا کو خود غرضی اور نا اتفاقی کے مرض نے ایسا چرلیا تھا کہ ایک کو ایک کھائے جاتا تھا۔ ادھر عمادالملک وزیر دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لایا۔ ادھر آدینہ بیگ خاں سابق صوبہ دار پنجاب نے مرہٹوں اور سکھوں کی کمک لے کر دُرّانیوں کو اٹک پار بھگا دیا۔ اب سواحل دکن سے وادی اٹک تک مرہٹوں کا پھریرا لہرا رہا تھا اور ہندوستان کی کھونٹ کھونٹ میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ناچار نجیب الدولہ نے احمد شاہ کو عرضی لکھی۔ کہ حضور والا جلد تشریف لائیں اور ہماری ننگ و ناموس کو مرہٹوں کے دست تعدی سے بچائیں ورنہ یہ قوم تخت مغلیہ کو الٹ دیگی اور ہمارا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیگی۔

اس عرضداشت کو پڑھ کر احمد شاہ پھر عازم ہند ہوا اور زیر دامن کوہِ ہمالہ کوچ کرتا ہوا۔ بلا تعرض سہارنپور تک آپہونچا۔ یہاں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں وغیرہ سرداران رہیلہ باریاب ملازمت ہوے اور درانی فوج کی کمک لے کر مرہٹوں کو نواح دہلی سے مار پیٹ کر نکالدیا

اور جب تک چنبل پار نہ ہو گئے۔ ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

مرہٹوں کا سردار راگھوباجی۔ ہندوستان سے جب اس ناکامی کے ساتھ واپس گیا۔ تو بھاؤ جو مرہٹوں کا وزیر اعظم اور سپہ سالار تھا اس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکی۔ اس وقت مرہٹوں کا اقتدار منتہائے عروج پر پہونچ گیا تھا۔ آراستہ رسالے۔ باقاعدہ ملٹنیں۔ اور عمدہ توپخانے اُن کے پاس موجود تھے۔ اُن کے دربار کی شان و شکوہ بھی مغلیہ دربار سے ہمسری کا دم بھرتی تھی۔ لہذا بھاؤ ایک لشکر عظیم فراہم کرکے بڑے کروفر کے ساتھ دلّی کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ مغلیہ سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے اور اس کاخ کہن کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ جب وہ دلی کے زیر فصیل آپہونچا۔ تو درّانیوں کی قلیل جماعت ایک خفیف مقابلہ کے بعد پسپا ہو گئی۔ بھاؤ نے دلّی پر قابض ہو کر مساجد و مقابر اور محلات شاہی کو خوب تاراج کیا دربار عام کا نقرئی کٹہرا اکھڑوا کر اور بیگمات کا زیور تک اتروا کر گلا ڈالا اگر اور سردار مانع و مزاحم نہ ہوتے۔ تو بھاؤ آمادہ تھا۔ کہ بسواس راؤ کو تخت دہلی پر بٹھائے اور چار دانگ ہند میں مرہٹوں کا سکہ چلائے۔ مگر یہ کام اس وقت تک ملتوی کیا گیا۔ کہ درّانیوں کو ہزیمت دے کر اٹک پار بھگادیں۔ اس لیے مرہٹوں کا لشکر آگے بڑھا اور کنج پورہ کے قلعہ کو جہاں معدودے چند درانی قابض و متصرف تھے محصور کر لیا۔

اس وقت احمد شاہ درّانی گنگا کنارے انوپ شہر کے مقام پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا اور شجاع الدولہ کو اپنی رفاقت پر مائل کر رہا تھا مرہٹوں کی یورش کے اخبار وحشت آثار سنکر اس نے چھاؤنی توڑ دی اور محصورین کنج پورہ کی اعانت کے لیے بر سبیل استعجال روانہ ہوا باغپت کے گھاٹ اس نے دریاے جمن کو عبور کرنا چاہا۔ مگر دریا تھا طغیانی پر اور اسباب گزارہ مفقود۔ ناچار اور آگے بڑھا اور کنج پورہ کے محاذات میں پہونچکر اس نے ایک تیر ترکش سے نکالا۔ اس پر کچھ دم کر کے دریا میں پھینکا اور لشکر کو حکم دیا۔ کہ فوراً گھوڑے دریا میں ڈالدو۔ وہ خدا کے حکم سے تم کو راستہ دیگا۔ اس تدبیر سے اس کا سارا لشکر پار اُتر گیا یہاں خبر لگی۔ کہ ایک دستہ فوج مرہٹہ کا سنبھالکہ کے سرا پر قابض ہے۔ لہذا قشون درانی کا ہراول ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور کامیاب ہوا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی فتح تھی۔ مگر درانی لشکر اس کو فال فیروزی سمجھ کر بہت خوش ہوا۔

اب درانیوں کی آمد آمد سن کر مرہٹوں نے بھی کنج پورہ سے کوس مراجعت بجایا اور دونوں لشکر نواحی پانی پت میں خیمہ زن ہوے مرہٹوں کے لاؤ لشکر کی بھیڑ بھاڑ اس قدر تھی۔ کہ آج تک نولاکھ نیزہ زبان زد عوام ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ مہابھارت کے بعد سرزمین ہند میں ایسا جمگھٹ فوجوں کا کبھی نہیں ہوا۔ خیر یہ سب مبالغہ سہی مگر اس میں شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کی جمعیت مع ہیر و بنگاہ بقول

بعض تین لاکھ اور بقول بعض پانچ لاکھ کے قریب تھی خاص قشون دُرّانی چالیس ہزار اور ہندوستانی سرداروں کی ماتحت فوجیں پچاس ہزار تھیں مرہٹوں کا توپخانہ دو سو توپوں سے زیادہ۔ مگر دُرّانیوں کی طرف صرف تیس توپیں تھیں۔

کچھ عرصہ تک دونوں لشکر مقابل ہمد گر پڑے رہے اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک بار بھاؤ کے حکم سے گوبند راے بندیلہ ایک دستہ فوج کا لیکر رہیلکھنڈ وا دوھ پر تاخت کرنے کے لیے نکلا۔ ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر شاہ درانی کو پہونچائی۔ شاہ نے سردار عطائی خاں کو جو قندھار سے تازہ وارد ہوا تھا۔ اس کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ سردار مذکور اپنے ماتحت سواروں اور کچھ رُہیلوں کو ساتھ لے راتوں رات یلغار کر کے صبحدم گوبند راے کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس کو تہس نہس کر کے گوبند راے کا سر شام تک بادشاہ کے سامنے لا رکھا۔ گاہ بگاہ رسد لانے والے گروہوں میں بھی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ غرض کئی مہینے تک پڑے پڑے طرفین کے سپاہی اور سردار تنگ آ گئے ادھر تو ہندوستانی سردار احمد شاہ سے ملتجی ہوے کہ ایک فیصلہ کی جنگ کیجیے۔ جو ہونا ہو سو ہو جاے۔ ادھر مرہٹے سردار بھاؤ سے متقاضی تھے۔ کہ لشکر میں غلہ اور سامان کا قحط ہے۔ یوں فاقوں مرنے سے تو بہتر ہے۔ کہ بر سر میدان لڑ کر مریں۔

آخر کار شجاع الدولہ کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کا پیغام بھیجا۔

احمد شاہ نے جواب دیا۔ کہ جنگ وپیکار کا معاملہ میری رائے پر رکھو اور صلح کرنی ہو تو تم لوگ مختار ہو۔ جو اپنے حق میں مصلحت سمجھو کرو شجاع الدولہ تو صلح وآشتی پر مائل تھا۔ الا نجیب الدولہ اٹھ بیٹھا اور سب ہندوستانی سرداروں کو سمجھایا۔ کہ اگر اس وقت مرہٹے کورے نکل گئے تو یاد رکھنا کہ آئندہ تمھاری خیر نہیں۔ غرض صلح کا معاملہ جھمیلے میں پڑ گیا۔ دو ٹوک فیصلہ قرار نہ پایا۔

ابھی پیک وپیام آجا رہے تھے۔ کہ آخر شب کو جاسوسوں نے خبر دی کہ مرہٹوں کا لشکر ایک زبردست حملہ کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ خبر شجاع الدولہ نے احمد شاہ کو پہونچائی۔ وہ اپنے خیمہ سے ہتھیار لگائے باہر آیا اور فوج کو آگے بڑھنے کا حکم سنایا۔ مگر شاہ کو اس خبر کی صحت میں ہنوز تردد تھا۔ کہ یکایک مرہٹوں کے توپخانہ کی زبردست فیر نے اس کی تصدیق کردی۔

جب مرہٹوں کا توپخانہ بآہستگی آگے بڑھتا چلا آیا۔ یہاں تک کہ اُسکے گولے درانی لشکر کے سر پر سے گذرنے لگے۔ تو مرہٹوں کے جنرل ابراہیم گردی نے فیر بند کرادی اور اپنی پلٹنوں کو آگے بڑھا کر سنگینوں سے حملہ کیا۔

اس حملہ نے روہیلوں کی صف کو جو درانیوں کے بازو سے رہنے کی محافظ تھی بالکل زیر وزبر کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک دم فوج سے بسواس راؤ نے درانیوں کے قلب لشکر پر جہاں احمد شاہ

کا وزیر حکم رانی کر رہا تھا سخت یورش کی۔ اس چپقلش میں وزیر کا برادر زادہ عطائی خاں کام آیا اور درانیوں کے قدم اکھڑنے لگے یہ کیفیت دیکھ کر وزیر اور اس کے رفقا گھوڑوں سے کود پڑے اور عزم بالجزم کر لیا کہ بغیر مرے مارے میدان کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

اس وقت گرد وغبار کی وجہ سے ہنگامۂ نبرد کا کچھ حال معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون غالب اور کون مغلوب ہے؟ مگر درانیوں کے نعرے اور ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کم ہوتی جاتی تھی۔ اس لیے محمد شاہ نے فوراً ایک دستہ وزیر کی کمک کے لیے عقب سے روانہ کیا اس کے پہونچتے ہی پھر گرما گرمی سے آتش جدال وقتال مشتعل ہو گئی اور خوب جم کر گھماگھمی سے لڑائی ہونے لگی۔ طرفین کے دلاور سورما دست بدست اور سینہ بسینہ ڈٹ گئے کہیں تلوار سے تلوار اور کہیں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔ نیزوں کی سنانیں اور سنگینوں کی نوکیں برق خاطف کے مانند کوند رہی تھیں بھاؤ اور بسواس اپنی فوجوں کو بڑھا بڑھا کر مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ ظاہرا مرہٹوں کا پلہ بہت بھاری نظر آتا تھا۔ اور درانی دبتے چلے جاتے تھے۔ مگر عین وقت پر احمد شاہ کو وہ چال سوجھی کہ طرفۃ العین میں بازی کا رنگ بدل گیا اس کی ہدایت کے مطابق سواران صف شکن کا دستہ۔ جو اس کی فوج کا چیدہ حصہ تھا۔ گھوڑوں کو سرپٹ اڑاتا۔ کاوا کاٹ کر نکلا اور یکایک غنیم کے بائیں بازو پر نہایت جوش وخروش کے ساتھ ٹوٹ پڑا۔

یہ حملہ نہ تھا بلکہ سحر و افسوں تھا جس کے اثر سے مرہٹوں کی دَل بادَل فوجیں کائی کی طرح پھٹ گئیں۔ کچھ ایسی ہل چل مچی کہ بالکل حواس باختہ ہو گئے اور جیتی جتائی بازی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پھر تو درانیوں اور رُہیلوں نے وہ وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ کشتوں کے پشتے اور مقتولوں کے انبار لگا دیے۔ بیس بیس کوس تک غنیم کا پیچھا دبائے چلے گئے اور جہاں مرہٹہ سپاہی پایا۔ وہیں اس کو ٹھکانے لگایا یہانتک کہ اسیران جنگ پر بھی کچھ رحم نہ کیا۔ جو ان کی تیغ بے دریغ سے بچ نکلا۔ اس کو دہاقین نے سنگوایا۔ بھاؤ۔ بسواس اور دیگر چیدہ سردار مرہٹوں کے وہیں کھیت رہے۔ صرف ہلکر اور سیندھیا زندہ بچے۔

جب بقیۃ السیف اپنے ملک میں پہونچے ہیں۔ تو تمام دکن میں گھر گھر کُہرام مچ گیا۔ کوئی قریہ اور قصبہ ایسا نہ تھا جہاں سے نالہ و فغاں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ ایسی خوفناک تباہی مرہٹوں پر کبھی نہ پڑی تھی اور بعد ازاں پہلی سی شان و شوکت اُن کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مورخین دقیقہ سنج نے مرہٹوں کی ہزیمت کا سبب یہ قرار دیا ہے۔ کہ وہ زورِ بازو و نیروے جسمانی میں خلقۃً اپنے حریف کے ہم مقابل نہ تھے اس لیے شدائد جنگ و مصائب رزم کو زیادہ برداشت نہ کر سکے۔

(محمد اسمٰعیل)

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ واجد علی شاہی دور کے بڑے مشہور نثار مقفےٰ نگار تھے۔ یہ طرز انشا جو کہ سراسر تکلف تھی۔ اُس پُر تکلف زمانہ میں چندے مقبول رہی۔ مگر اب تو بالکل مردہ وافسردہ ہوگئی ہے۔

جاڑے کی شدّت

ناگاہ ایک روز گذر موکب حشمت وجلال۔ با فرّ و شوکت کمال۔ ایک صحرائے باغ و بہار دشت لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر۔ بُو باس ہر برگ گل کی رشک مِشک اذفر صفحۂ بیاباں معنبر و معطر۔ چشموں کا پانی صفا میں آب گوہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلہ کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھردی تھی پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے۔ بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھرتھراتے تھے سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی۔ منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دم دبا کے بانبی میں بھاگ جاتا تھا

زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔ اشک شمع انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے لحاف میں منھ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا۔ پگلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینہ میں آگ تھی گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنور فلک چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ لنجوں نے بٹیر پکڑی۔ لوے لولوں کے ہاتھ آئے لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سرزمین ہند میں مُردے نہ جلتے تھے زندوں کے ہاتھ پانوں گلتے تھے۔ آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھائی تھی۔ مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے عذار لالۂ حمرا رشک زعفران تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں۔ کہربائی پتے۔ بہار میں رنگ خزاں تھا۔ اس سردی کا کہیں ٹھکانا تھا۔ حمام تہ خانہ کا خس خانہ تھا آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے۔ زردشت کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ آفتاب عازم برج حمل تھا۔ آتش پرستوں کا عمل تھا زیست سمندر کے عنوان تھی۔ آگ میں خلقت کی جان تھی۔ جاڑے

میں ہر ایک الست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا تمام اہل لشکر کو تپ لرزہ کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے اینٹھے جاتے تھے۔ ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے تمنچے۔ چقماق۔ پتھر کلے لاٹھی سے بیکار ہو گئے تھے چانپ سے پتھر آگ نہ دیتے تھے۔ اور توڑے دار کا یہ حال تھا بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اٹھانا محال تھا۔ توڑا ہر ایک گل تھا۔ توتے کی جگہ شور بلبل تھا ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کینچے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے۔ ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے۔ جگنو کو چنگاری کے دھوکے اُٹھانے کو تھم گئے تھے۔ سردی بسکہ کار فرما تھی۔ ایک کو دوسرے کی تمنا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالمگیر ہوا تھا کہ کرۂ نار زمہریر ہوا تھا۔

(سرور لکھنوی)

میر امّن دہلوی

میر امّن دلّی کے رہنے والے تھے۔ بتلاش معاش چندے عظیم آباد میں قیام کیا۔ وہاں سے چل کر کلکتہ پہونچے۔ جان گلگرسٹ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ صاحب موصوف کی فرمایش سے ۱۸۰۱ء میں قصہ چار درویش کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی نثر اس زمانہ کے روزمرہ اردو اور محاورات دہلی کا نہایت فصیح و صحیح نمونہ ہے۔

قصّہ

یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ چوپڑ۔ گنجفہ۔ شطرنج۔ تختہ نرد کھیلا کرتا یا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یاروں آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا باز۔ بہری۔ جرہ۔ باشہ۔ سرخاب اور تیتروں پر اڑاتا ہوا دور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا۔ کہ جدھر نگاہ جاتی کوسوں تک سبزے اور پھولوں سے زمین لال نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے۔ ناگاہ اس صحرا میں دیکھا۔ کہ ایک کالا ہرن۔ اس پر زربفت کی جھول اور بھنور کلی مرصع کی اور گھنگرو سونے کے زردوزی پٹے میں ٹکے ہوے گلے میں پڑے

خاطر جمع سے اُس میدان میں۔ کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سم کی آہٹ پاکر چونکتا ہوا سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔ مجھے اسکے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ کہ رفیقوں سے کہا۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ میں اسے جیتا پکڑوں گا خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرندتھا۔ کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر۔ ان کی کرچھالوں کو بھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہوا۔ گھوڑا بھی باؤ سے باتیں کرتا تھا لیکن اسکی گرد کو نہ پہونچا۔ وہ رہوار پسینہ پسینہ ہوگیا اور میری بھی جلیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی۔ پر ہرگز کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں! کہاں سے کہاں نکل آیا؟ ناچار ہو کر اُس کو بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قربان سے کمان سنبھال کر چلے میں جوڑ کشش کان تک لاکر ران کو اس کی تاک "اللہ اکبر" کہکر مارا بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانوں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پا پیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُسی کوہ کا ارادہ کیا اور اس کا ساتھ دیا۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا جب پاس پہونچا ایک باغچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوہ ہوگیا۔ میں نہایت تھکا تھا۔ ہاتھ پانوں دھونے لگا ایکبارگی آواز رونے کی اُس برج کے اندر سے میرے کان میں

آئی جیسے کوئی کہتا ہے "اے بچّے! جس نے تجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُس کو میرا سا دکھیا بنا وے۔" میں یہ سُن کر وہاں گیا۔ تو دیکھا کہ ایک بزرگ ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے اس کی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بد دعا دیتا ہے میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ "حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی خدا کے واسطے معاف کرو۔" بولا کہ "بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر انجان تجھ سے یہ حرکت ہوئی۔ تو اللہ معاف کریگا۔" میں پاس جا بیٹھا۔ اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اس پیر مرد نے حاضری جو اُس وقت موجود تھی مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔ ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی آنکھیں ملکر جو دیکھتا ہوں۔ تو نہ اُس مکان میں وہ بوڑھا ہے نہ کوئی اَور ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے۔

میر امّن دہلوی

شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ

حضرت علیا کوئن وکٹوریہ کی سوانح عمری

مدبران ملکی

جب ملکہ معظمہ اورنگ آرا ہوئیں تو ان کے وزیر اعظم لارڈ میلبورن تھے جن کی طبیعت آرام طلب تھی وہ پولٹیکل معاملات میں اپنے مخالفوں کے ساتھ راست معاملہ اور کشادہ خاطر تھا اور اپنے دوستوں کا دل خوش کرتا تھا۔ اسکی خود طبیعت میں قوت ایجاد نہ تھی بقول شخصے اس کو خود تو بونا کچھ نہیں آتا تھا مگر جو اوروں کا پہلے سے بویا ہوا ہو اس کو نشوونما دینا خوب آتا تھا۔ طبیعت میں سہل انکاری بڑی تھی۔ اس کی بی بی خود بیان کرتی ہے کہ میرے شوہر میں اوروں کے اخلاق کی نگہبانی کرنے کی لیاقت نہ تھی"۔ اسکی تقریر میں ایسی طاقت نہ تھی کہ اگر وہ اپنے مخالف کی پُرزور تقریر کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا تو اس سے عہدہ برآ ہوسکتا۔ وہ کوئی بڑا مدبر ملکی نہ تھا۔ مگر امن و عافیت کے زمانہ میں حکمرانی کرنے کی اور کسی تدبیر میں غلطی نہ کرنے کی لیاقت خوب رکھتا تھا۔ وہ ایک نوجوان ملکہ کا وزیر تھا یہ اُس کی خوش نصیبی تھی۔ کہ یہ ملکہ سمجھ بوجھ ایسی رکھتی تھی کہ اس سے خود کام لیتی تھی اور اسکے ہاتھ میں کٹ پتلی نہیں بنتی تھی اس کے کاموں کا حصہ وزیر ہی کے صلاح و مشورے پر نہ تھا۔ اس پر لوگوں کو بڑا رشک و حسد تھا کہ ملکہ معظّمہ اُس کو عزیز رکھتی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے اس وجہ سے اُس میں عیب

طرح طرح کے نکالتے تھے کوئی کہتا تھا کہ وہ ملکہ معظمہ کے مزاج میں ایسی بے اعتنائی و سہل انکاری پیدا کرانی چاہتا ہے جیسی کہ خود اُس کے مزاج میں ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ اپنے اختیار و اقتدار کی امداد کے لیے ایسی تدابیر کرتا ہے کہ اپنے سارے رشتہ داروں اور دوستوں کو ملکہ معظمہ کے ارد گرد جمع کرتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ملکہ معظمہ اسکو یہ سمجھنے لگیں کہ اس کے بغیر سلطنت کا کام نہیں چلنے کا۔ ڈیوک ولنگٹن یہ فرماتے تھے کہ مجھے یہ اُمید نہیں کہ اس نوجوان ملکہ کے عہد میں فرقہ ٹوری کو کامیابی حاصل ہو وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ عورت مرد کے برابر کونسٹیٹوشن کی صحیح پولیسی کام میں لائے گی۔ اور گورنمنٹ کے کاموں میں کسی اپنے ذاتی خیالات پر کار فرمانہ ہوگی۔ یہ وزیر ملکہ کو خود صلاح دیتا کہ فرقہ ٹوری میں وہ اپنا اعتبار پیدا کریں۔ سچ بات یہ ہے کہ یہ وزیر خوش مزاج نیک طبع تھا۔ وہ دل سے یہ چاہتا تھا کہ ملکہ کی زندگی خوشی و خرّمی سے بسر ہو۔ اور ان کی سلطنت کا جاہ و جلال بڑھے ان ہی دو باتوں میں وہ جانفشانی کرتا تھا وہ اپنے اختیار و اقتدار کا بھوکا نہ تھا وہ اُن کے حاصل کرنے میں یا اُن کے برقرار رکھنے میں ناجائز وسائل کو کام میں نہیں لاتا تھا۔ ملکہ معظمہ اس کے احسانوں کو مانتی تھیں اور اُس سے محبت و الفت کرتی تھیں۔ لارڈ ہوس میں اس وزیر کے دو بڑے زبردست مخالف لارڈ بروہم اور لارڈ لنڈ ھرسٹ تھے جن کا بیان آگے کیا جاتا ہے۔

لارڈ بیروہم

انگلستان کے زمانۂ حال کی تاریخ میں لارڈ بیروہم کے برابر کوئی دوسرا شخص عجیب وغریب آدمی نہیں بیان کیا جاتا۔ وہ طرح طرح کی لیاقتوں اور قابلیتوں وذہانتوں کا جامع تھا سخت محنت کرنے کی لیاقت ایسی تھی کہ وہ قدرت بشری کی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ جتنی جفاکشی کرتا اتنا ہی خوش ہوتا فقط اسے محنت کرنے کی لیاقت ہی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ کام کرنے کا شوق بھی حد سے زیادہ تھا۔ ہر وقت فتحیابی کے نئے میدانوں کی جستجو میں اس کی مستعدی وچستی وچالاکی چین نہیں لیتی تھی۔ جس مطالعہ میں کہ لوگ اپنا سارا وقت صرف کرکے فرسودہ ہو جاتے ہیں وہ اسکو اپنی تفریح طبع جانتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی جن یا دیو کام کرنے کے لیے بیٹھا رہتا ہے کبھی اسکی جسمانی قوت تھکنا جانتی ہی نہ تھی کبھی اولوالعزمی وبلند ہمتی اُسکی ذات سے منفک ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ اس میں خود اعتمادی پرلے درجے کی تھی۔ وہ اپنے تئیں ہمہ داں جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میں ہر کام کو اوروں سے بہتر کر سکتا ہوں اور اُن کاموں کو جن کا کرنا خاص آدمیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اُن سے اچھی طرح میں اُن کو کر سکتا ہوں۔ یہ مغرورانہ لاف زنی کبھی اس کی ہنسی اُڑواتی کبھی اس کی ذہانت کی تعریف کراتی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پارلیمنٹ کا اچھا اوریٹر تھا (انگریزی زبان میں اوریٹر اُس مقرر کو کہتے ہیں جو اپنی تقریر میں اپنے دلائل کو اپنے جوش وجذبۂ دلی کے ساتھ بیان کرے اور ڈبیٹر اُس مقرر کو کہتے ہیں جو مدلل مباحثہ ومناظرہ کرے سپیکر اُس مقرر کو

کہتے ہیں کہ وہ خوش تقریر ہو۔ یہ تین لفظ یاد رکھنے چاہییں) مگر وہ ایسا اعلےٰ درجے کا اورٹیر نہ تھا کہ زمانۂ آیندہ میں اسکی اسپیچیں کسوٹی پر پوری اتریں۔ اسکی زبان ایسی فصیح و بلیغ نہ تھی کہ وہ زمانۂ آیندہ کی خوبیوں کو دکھا کر پائدار رہتیں مگر اس میں شک نہیں کہ جس وقت اور جس گھڑی اُس نے تقریریں کیں انھوں نے سامعین کے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا۔ جب کبھی پولٹکس میں لٹریچر (علم ادب) میں سائنس میں آرٹ میں تجارت میں صنعت و محنت پردازی میں کوئی سپیچ دیا۔ اُس نے معلم کا کام کیا جب وہ لارڈ چنسلر یعنی ایسا وزیر مقرر ہوگیا کہ جسکے پاس سلطنت کی بڑی مہر رہنے لگی۔ اور بادشاہ و وزراء کو قانونی مشورہ دینے لگا تو اُسکی نسبت بڑے بڑے دانشمندوں نے یہ کہا کہ وہ ہر چیز کو تھوڑا تھوڑا جانتا ہے قانون بھی تھوڑا سا جانتا ہے۔ اس عُہدے کے پانے سے ملکی پولیسیوں و تدابیر پر اعتراض کرنے میں وہ اپنی ساری تدابیر و لیاقتیں کام میں لانے لگا۔ اس خودنمائی کی گھٹا اُسپر ایسی چھائی کہ اسکے سر پر سے کبھی نہ ٹلی۔ گو وہ بڑا خود پسند۔ خودبیں خودرائے خوداعتماد تھا مگر اس نے اپنے زمانہ میں ملکی و تمدنی معاملات کی اصلاح کرکے انکو اپنے عروج پر پہونچایا۔ بنی آدم کی آزادی اور عام تعلیم میں جانفشانی ایسی کی کہ نہایت قدرشناسی کے قابل ہے۔ وہ کولونیوں (وہ نوآبادیاں جو انگلستان سے آدمیوں نے نقل مکان کرکے ویران زمینوں میں بسائیں) میں غلامی کا نام باقی رکھنا نہیں چاہتا تھا وہ سب مذاہب کے مساوات و عام تعلیم کا خواستگار تھا۔ اور اُس میں اپنے اہتمام سے کامیاب ہوتا یہ جو انمرد عاقل وزیر اعظم لارڈ میلبورن کے کاموں میں بڑی عیب بینی و نکتہ چینی کرتا تھا۔

لارڈ لنڈھرسٹ

یہ لارڈ وزیر اعظم کا دوسرا زبردست مخالف تھا۔ یہ لارڈ پارلیمنٹ میں اس وقت مباحثہ اور تقریر خوب کرتا تھا جس وقت کہ بڑے بڑے زبردست تقریر و مباحثہ کرنے والے پیل پامرسٹون۔ گلیڈسٹون۔ ڈزرئیلے۔ برائٹ۔ کوبڈین موجود ہوتے۔ اسکی زبان میں نفاست۔ لطافت۔ سلاست۔ طلاقت تھی پاکیزہ خیالات واصلی مطالب ومتین دلائل کو سلیس الفاظ میں بیان کردیتا جب کام موجود ہوتا تو اسکے انجام دینے میں وہ تھکتا نہ تھا مگر اسکی طبیعت کا اقتضا آرام طلبی کی طرف ایسا تھا جیسا کہ لارڈ بروہم کا کام طلبی کی طرف وہ فرقۂ ٹوری کی حمایت کرتا اور اسکے مخالفین سے مباحثہ میں جرح و قدح ایسی کرتا کہ اُن کو قائل ہی بنا کے چھوڑتا۔ ایسے ہموار سپیچ دیتا کہ اس میں کہیں عقل کی پستی معلوم نہ ہوتی۔ مباحثہ کے ابتدا ہی میں وہ ایسی بلندی پر پہونچ جاتا کہ پھر اس سے کبھی نیچے نہیں اترتا۔ مگر وہ اُورٹیر اچھا نہ تھا۔ اُورٹیری میں تو سارے اعلیٰ درجہ کی لیاقتوں کو اپنی مرضی کے موافق حاضر کر لینا ایسا ہی بس میں ہوتا ہے جیسا کہ شاعری میں یہ بات اس میں نہ تھی۔ لارڈ میلبورن کے یہ دو حریف بے نظیر مباحثہ کرنے والے ایسے تھے کہ اس کے فریق میں اوّل درجے کا کیا دوسرے درجے کا بھی کوئی بحث کرنے والا ان کے مقابل کا نہ تھا اُس وقت پارلیمنٹ کا حال شکستہ جہاز کے تختے کا سا تھا جو پانی میں بہا جاتا ہو اور اُس پر چاروں طرف سے دشمنوں کی گولیوں کی بوچھاڑیں پڑرہی ہوں۔

نئی گورنمنٹ اور نامور ممبروں کے نام

ملکہ معظمہ کی اورنگ آرائی کے سبب سے ضرور ہوا کہ ایک نئی پارلیمنٹ مرتب ہو۔ اس میں دونوں پارٹی (فریق) وگ و ٹوری میں آپس میں پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ایک دوسرے پر رشک و حسد کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر گھاتیں لگاتے تھے۔ اور داؤں پیچ کھیلتے تھے۔ جب ایک مطلوب پر دو طالب لڑتے اور ٹکراتے ہیں تو شرارت کے شرارے نمودار ہوتے ہیں پس دونوں فریق سے شرارتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ دونوں فریق کی حالتوں میں تبدّل و تغیر نہیں ہوتا تھا۔ ٹوری کو خفیف سا یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ اس کا نام بدل کر کنسر وٹیو ہو گیا۔ اس دفعہ پارلیمنٹ میں ایسے ارباب کمال جمع ہوئے کہ پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے نام نامی یہ ہیں جو ہمیشہ یاد رکھنے چاہییں۔

مسٹر گروٹ۔ تاریخ یونان کے مصنف جو لنڈن کی طرف سے منتخب ہوئے

لارڈ ولٹن۔ جو اس زمانہ کے سب سے زیادہ سرفراز ریڈیکل تھے (یہ فرقہ دونوں فرقہ وگ و ٹوری سے مخالف ہے)

مسٹر ڈزرئیلی۔ جو بڑے اولوالعزم جلیل القدر تیز فہم تھے اگر جلد نہ مرجاتے تو بڑے بڑے کام اُن سے انجام پاتے۔

سر ولیم مور ورتھ۔ یہ اُس مدرسہ کے عمدہ نمونہ تھے۔ جس کا نام پچھلے زمانہ میں فلسفیانہ ریڈیکل ہوا۔

مسٹر روبوک اِسی مدرسہ کے ممتاز ممبر تھے مگر وہ پارلیمنٹ کی ممبری سے خارج ہو گئے۔
مسٹر گلیڈسٹن۔ ۵۰ برس سے پارلیمنٹ کے ممبر تھے جن کی لیاقت وقابلیت کا سچے ایک عالم میں شہرہ ہوا۔
لارڈ کارسل۔ ایک نوجوان صلح طلب عالم وذی فن تھے تفریح طبع کے لیے کچھ پولٹیکس بھی سیکھ لیا۔
لارڈ جان رسل وہ پچھلے زمانہ میں کامنس ہوس کے پیشوا ہوئے۔
لارڈ پامرسٹون۔ فورین سیکرٹری تھے اِن میں جو لیاقت عظیم تھی اس کا ظہور اب تک نہیں ہوا تھا۔ وہ بیس برس سے ملازم تھے مگر ان کی لیاقت کی شہرت ہنوز نہیں ہوئی تھی۔ بعد ازاں ان کی لیاقتوں اور قابلیتوں کی وہ شہرتیں اور عزتیں ہوئیں کہ اُن پر تعجب ہوتا ہے۔ ان کے دلی دوست پہلے سے واقف نہ تھے کہ اُن میں ملک اور پارلیمنٹ پر حکومت کرنے کی لیاقت وقابلیت ہے۔
سر رابرٹ پیل۔ کن سرویٹو فریق کا ہادی و رہنما اور پارلیمنٹ کا زبردست اور ٹیر تھا۔
اوکونیل شیل یہ دونوں آئرش فریق کے نائب تھے۔
یہ اتفاق کی بات ہے کہ سنہ ۱۸۳۷ء کی پارلیمنٹ میں مسٹر مکالی اور لارڈ بک پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے یہ کہنا صحیح ہے کہ چالیس برس کے عرصے میں کوب ڈین اور براٹٹ کے سوائے جو بڑے سپیکر تھے کسی ممبر

پارلیمنٹ کی تحریرات کی فصاحت کو نہیں بڑھایا۔ چار برس کے بعد کوب ڈین پارلیمنٹ کا ممبر مقرر ہوا تھا۔

گو وزارت کے کامنس ہوس اور لارڈس ہوس میں بڑے بڑے زبردست عالی دماغ و روشن ضمیر ممبر تھے مگر ان میں پیوستگی کی بندش ایسی ڈھیلی اور سست تھی کہ وہ وزارت میں زور و قوت نہیں پیدا ہونے دیتی تھی۔ کنسرویٹو فریق کی جان سر روبرٹ پیل تھے۔ وہ پارلیمنٹ میں مباحثہ کرنے میں بادشاہ تھے ان کو مباحثہ کی ہوا ایسی موافق تھی جیسی کہ اڈیسن کو شراب کہ اسکے زور و اثر سے وہ اس طلسم کو توڑ ڈالتے جسمیں عقل محبوس ہوتی۔ اور پھر عقل کو اس قید سے چھڑا کے خوب جولانیوں پر لاتے۔ اُن کی انشا پردازی میں متانت و فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ پارلیمنٹ کے مقاصد دلی کو صاف صاف پاکیزہ زبان میں بیان کر دیتے۔ دلائل متین سے صحیح نتیجہ نکالتے اگر کہیں اس میں مغالطہ کا شائبہ ہوتا تو اُن کو ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ان کی سپیچیں سامعین کے دلنشیں و خاطر نشاں ہو جاتیں۔ وہ نا آشنا مزاج تھے۔ اُن کے دل میں محبت کی حرارت کم تھی اور جتنی تھی وہ انکے دل ہی میں رہتی۔ دوسرے تک نہ پہونچتی۔ اجنبی آدمی تو ان سے اچٹ کر ایسے اُلٹے آتے جیسے کہ پتھر سے گیند۔ وہ دل کے بُرے نہ تھے۔ گو نا آشنا مزاج تھے۔ کامنس ہوس میں اُن کی ذہانت و لیاقت کے جوہر کھلتے تھے۔ مخالفین کہتے تھے کہ پیل میں ایجاد کرنے کا مادّہ نہیں ہے وہ اوروں کی تقلید کرتے ہیں۔ جن اصول پر چلتے ہیں وہ سرے ہی سے غلط ہیں۔ ان کا حال بچوں کا سا

ہے جو کسی بات کو ایجاد کرنا نہیں جانتے جو ان کے اپنے دماغ سے نہ نکلی ہو لارڈ سٹین لی بھی ایسے مستعد و جیّد سپیکر تھے کہ پارلیمنٹ کا کوئی دوسرا ممبر ذرا سی دیر تک بھی اُن کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ زمانۂ حال کے سائنسوں سے آگاہ نہ تھے جن کی نسبت انھوں نے ظرافتہً یہ کہا کہ "میں اس زمانہ کا پرورش یافتہ ہوں کہ سائنس کا وجود نہ تھا"، مگر وہ قدیمی زبانوں سے خوب ماہر تھے اور یوروپ کے معاملات ملکی کے جاننے میں اُن کو کمال تھا۔ پارلیمنٹری سائنس کے جاننے میں وہ ید طولےٰ رکھتے تھے۔ یہ نعمت ان کو خداداد ملی تھی۔ لارڈ جان رسل کو ان کے دوست نڈر جوانمرد جانتے تھے۔ اور اُن کے دشمن اُن کو خود بین، خود نما، خود را سمجھتے تھے جس وقت صاحب موصوف نے معاملات ملکی سے دست کشی کا ارادہ کیا تو طامس مور شاعر نے جو ان کا دوست تھا نظم تصنیف کی کہ "تیری ذہانت و جودت، تیری نوجوانی، تیری ناموری، شہادت دیتی ہیں کہ مدبر و منتظم ملکی ہونا تیری جبلت میں ایسا ہی داخل ہے جیسا کہ ہما کا سورج کے سامنے آنکھیں کر کے ہوا میں اڑنا۔ میں تجھ سے عاجزی سے عرض کرتا ہوں کہ تو اپنے ملک کو جس کے افق پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی روشنی سے محروم نہ کر"، پھر شاعر یہ کہتا ہے کہ "تیری فصاحت کا کمال ان نالوں کی طرح نہیں ہے جو ایک بلندی سے اترتے ہیں اور چمکتے ہیں اور جھاگ اٹھاتے ہیں اور بخارات بن کر اڑ جاتے ہیں۔ بلکہ اُس کا حال اس سیل کا سا ہے جو روشنی میں خیالات اور علم چھپانے والے کونوں میں اپنا راستہ بناتی ہے

گویہ بیان ایک دوست کا شاعرانہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اسکے دلائل کی تپلی دھار آہستہ آہستہ اُن چٹانوں میں اپنا راستہ نکال لیتی ہے جو دیکھنے والوں کو ابتدائے نظر میں یہ معلوم ہوتی ہیں کہ ان کے اندر وہ دخل نہیں پاسکے گی مخالف کی ضعیف دلیلوں میں اس کی دلائل تیزاب کی طرح گھسکر ان کو تحلیل کردیتیں۔ لارڈ سل کی شمشیر بازی سلطان صلاح الدین کی طرح اپنی وضع کا بڑا اثر دکھاتی تھی۔ انگریزی گورنمنٹ کے نظام کا حال یہ تھا کہ اس میں مخالف وموافق سردار جدا جدا برسوں تک آپس میں مقابلہ کے لیے کھڑے رہتے اور لڑائیوں کے سلسلہ کو جاری رکھتے۔ جب ایک کی فتح ہوتی تو وہ اپنی جگہ بدلتا۔ فاتح صاحب خدمت ہوجاتا۔ مفتوح اس کے مقابلہ میں جگہ پاتا اگر یہ دونوں سردار عقل وفہم وتقریر ومباحثہ میں آپس میں برابر کی جوڑ ہوتے اور ان کے زور تُلے ہوئے ہوتے تو پھر دو جتھے پیدا ہوتے۔ ایک ایک سردار کا اور دوسرا دوسرے سردار کا طرفدار ہوتا اور ایک دوسرے کی عیب جینی ونکتہ چینی کرنے لگتا۔ پولیٹکس میں مثل آرٹس کے ایجاد اُن کے خیالات پر مبنی ہوتا ہے جو آدمی خود پیدا کرتا ہے یا اوروں سے پاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایجاد کرنے میں دونوں سر رابرٹ پیل اور لارڈ رسل کا حال ایک ہی سا تھا۔

اس زمانہ میں معاملات ملکی وانتظامات سلطنت کے اکھاڑے میں بڑے بڑے پہلوان اترے اور آپس میں خوب خم ٹھوک کر کشتیاں لڑے کبھی پچھڑے کبھی پچھاڑا۔ ان پہلوانوں کے نام یہ ہیں پیل۔ سل۔ شیل اوکنل

گروٹ۔ چارلس بلور۔ ڈزرئیلے۔ گلیڈسٹن۔ سٹین لی۔ سمتھ اوبرن۔ ٹوم ڈن کوب
اِن ہی عقل و دانش کے پہلوانوں نے انگلستان سے اس جہالت کو جو حضرتِ علیا کی ابتدائے سلطنت میں پھیلی ہوئی تھی باہر نکال دیا۔

فرزندان شاہی کی تعلیم

جب پرنس ویلز کی عمر ماشاء اللہ اُستاد کے پاس بیٹھنے کے قابل ہوئی تو اُن کے والدین کو یہ فکر ہوا کہ کون شخص ان کا اُستاد مقرر ہو اور کس طریقہ سے اُن کی تعلیم ہو۔ مئی ۱۸۴۸ء میں مسٹر ہنری برچ پرنس ویلز کے استاد مقرر ہوئے۔ جن کا حال پرنس البرٹ ۶۔ اگست ۱۸۴۸ء کو لارڈ مورپیتھ کو یہ لکھتے ہیں کہ "جب مسٹر برچ سے میری اول ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بڑے اچھے آدمی معلوم ہوئے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اُن سے بچے بآسانی مانوس ہو جائیں گے اب وہ پرنس ویلز کی استادی کی خدمت پر مقرر ہونے کو ہیں" اور اسی باب میں عالی جناب نے اپنی سوتیلی ماں کو یہ خط لکھا کہ "ہمارے بچے خوب تازہ و توانا و تندرست ہیں اور برٹی (پرنس ویلز) چند ہفتے کے اندر استاد کے پاس پڑھنے کے لیے بیٹھے گا۔ اس کے واسطے مسٹر برچ کو استاد مقرر کیا ہے وہ ایک نوجوان خوش صورت، نیک سیرت شریف ہیں۔ ایٹن کالج میں

معلم تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اعلیٰ درجہ کی اونرین پائی ہیں۔ اُن کے شاگرد بھی لیاقت میں مشہور ہیں۔"

یہ اوّل مرحلہ کہ بچّوں کے لیے اچھا استاد مقرر کیا جائے بڑا مہتم بالشان ہے۔ خُدا اپنے فضل وکرم سے اس میں برکت دے ان دنوں عموماً شہزادوں کی تعلیم پر اور خصوصاً ان شہزادوں پر جو بادشاہی کے لیے مقرر ہوے ہیں دنیا کی صلاح وفلاح زیادہ تر موقوف ہے۔ فقط۔

ڈونڈسر کیسل۔ ۱۰۔ اپریل ۱۸۴۴ء۔

حضرت عُلیا اور عالیجناب کے اوّلین افکار میں یہ بھی ایک فکر تھا کہ کن اُصول کے موافق بچّوں کی تعلیم دلائیں۔ سٹوک مُیر جرمن کے ارباب کمال میں سے تھے اور انگریزی عملی عقل کے پتلے تھے۔ اور دونوں میاں بی بی کے بڑے نیک صلاح کار تھے اُن سے اس باب میں صلاح ومشورہ پوچھا اُن کا یہ مقولہ لوگوں کو خوب یاد تھا کہ "بچہ کی روز ولادت سے تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جیسی محل شاہی میں اس تعلیم کی ضرورت ہے ایسی کہیں اور نہیں" تعلیم کے باب میں ۶ مارچ ۱۸۴۲ء کو انھوں نے ایک یادداشت لکھی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اچھی تعلیم بہت جلد نہیں شروع ہوسکتی انگلینڈ کا ایک نامور حکیم لوک لکھتا ہے کہ "بچوں میں خوشی رنج محبت عداوت غصہ وغیرہ یعنی اخلاقی باتوں کا ظہور بہت پہلے ہونے لگتا ہے بہ نسبت قوائے عقلیہ کے جن سے استدلال کرکے نتائج نکال سکے پس اس لیے چاہیے کہ تعلیم کی ابتدا بچے کے فطری شعور وفہم کو باقاعدہ بناکے راہ مستقیم

پر لائے اور اُس کے دل کو پاک اور مقدس اس طرح بنائے کہ اُن کے پاس صرف پاک طینت اور نیک سیرت ہی آدمی آئیں جائیں اور صرف اُن کو پند و نصائح ہی نہ کی جائیں بلکہ ان کو نیک کردار وافعال دکھاکے تعلیم کی جائے۔ بچّوں کا مقتضائے طبیعت یہ ہوتا ہے کہ اپنے آس پاس کے آدمیوں کے کاموں کو بہت غور سے دیکھتے ہیں اور اُن کی باتوں کو کان لگاکے سُنتے ہیں اور انھیں کی وہ تقلید کرتے ہیں۔ ملکۂ معظمہ اور عالیجناب کو یہ خوب سمجھنا چاہیے کہ بہ نسبت اور والدین کے ان کا کام اولاد کی تعلیم میں اس لیے زیادہ تر مشکل ہے کہ اولاد شاہی کے لیے صرف یہی امر ضروری نہیں ہے کہ اُن کے اخلاقی خصائل تعلیم سے درست ہو جائیں بلکہ اُن میں تعلیم سے یہ لیاقت بھی پیدا ہونی چاہیے کہ جب وہ بادشاہ ہو جائیں تو فرمانروائی کے دشوار فرائض کو کامیابی کے ساتھ ادا کریں۔ پس بادشاہوں کو اپنی اولاد کی تعلیم کی جواب دہی ایک امرِ عظیم ہے۔ بادشاہوں کا اطمینان خاطر اور اُن کے کنبے کی خوشی و خرمی اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کماحقہ تعلیم کرائیں۔ قوم اور ملک کا خوشحال ہونا اس کے بادشاہ کے ذاتی خصائل پر منحصر ہے انگلینڈ کے بادشاہ کی نیک تعلیم پر انگلینڈ کی بھی بھلائی موقوف ہے۔ اب تک جارج سوم کا نام اس کے ذاتی نیک صفات کے سبب سے تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تاریخ آزادانہ انصاف کے ساتھ اسکی شاہانہ لیاقتوں کی اور اس کے ذاتی اوصاف کی تعریف کرتی ہے لیکن جارج سوم کیا تو جانتا ہی نہ تھا کہ اولاد کی

تعلیم کے لیے مربیانہ فرائض کیا ہوتے ہیں۔ یا جانتا تھا تو دیدہ و دانستہ اُن سے غفلت کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایام طفلی میں اس کی اولاد کے دلوں کے اندر حسن اخلاق کے اصول بیٹھے ہی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر بادشاہ کی اولاد کی تعلیم نیک نہ ہو تو وہ بہت بد اخلاق ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ استادوں کی اعانت و حمایت نہ کریں کہ جس کے سبب سے استاد ان کی اولاد کی تعلیم دل نہاد ہو کر نہ کر سکیں تو تعلیم بگڑ جاتی ہے۔ مگر سٹوک میر نے اس پر نہیں خیال کیا کہ بعض دفعہ مربی اور استاد دونوں تعلیم کے فرائض ادا کرتے ہیں لیکن اُن کے مقابلہ میں اور زور ایسا اثر کرتے ہیں کہ وہ تعلیم کے کاموں کو چلنے نہیں دیتے (اس کی مثالیں ہندوستانی حکمرانوں میں بہت ہیں) ان کی تمام پند و نصائح ان بیجوں کی طرح ضائع ہو جاتی ہیں جو انجیل کی تمثیل میں بیان کی گئی ہے کہ "بیج پھینکے گئے اور زمین میں پتھروں پر پڑے جہاں کانٹے اُگے اور انھوں نے اُن کو دبا دیا" سٹوک میر نے ہورس کے اس مقولہ پر نہیں خیال کیا کہ "کسی سچی بات کا جاننا اور پسند کرنا خطا کرنے سے روک نہیں سکتا"۔ شکسپیر شاعر کہتا ہے کہ "اگر نیکی کرنا ایسا ہی آسان ہوتا جیسا کہ اس کا جاننا تو چیپل (چھوٹے گرجا) بڑے چرچ (بڑے گرجا) ہوتے اور غریب آدمیوں کے جھونپڑے بادشاہی محل ہوتے"، غرض دانستنی اور چیز ہے اور کردنی اور شے ہے۔

بیرن سٹوک میر نے جارج سوم کی اولاد کی تعلیم سے نتیجہ نکال کر ملکہ معظمہ اور عالیجناب کو یہ سبق پڑھایا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم اوّل ہی سے سچی اخلاقی اور انگلشی

کریں۔ اور ایسی تعلیم کرانے کی ترکیب یہ بتائی کہ بادشاہوں کے بچے اول ہی سے ایسے معلموں کے سپرد کیے جائیں کہ نیک نہاد، عاقل، تجربہ کار، دنیا سے خبردار ہوں ایسے ہی لائق استاد جان سکتے ہیں کہ عقلی اور اخلاقی تعلیم کے لیے کن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور انکی تعمیل کیونکر ہو سکتی ہے جب ایک دفعہ ایسے معلم منتخب ہو جائیں تو پھر اس امر کی ضرورت ہے کہ مربی بادشاہ اُن استادوں کی ضروری حمایت اور استعانت بخوبی کریں تاکہ صرف اس وجہ سے معلم دل نہاد ہو کر اپنے دشوار فرائض معلمی کو کامل طور پر ادا کرے مربیوں کو معلموں پر بیشک وریب اعتماد کرنا چاہیے۔ بغیر اس کے شاگرد استاد کی تعظیم و اطاعت نہیں کریں گے اور نہ معلم اپنے حیطۂ اختیار میں شاگردوں کی ضروری تادیب و تربیت کو لا سکے گا۔ جب تک معلم کی تقویت و حمایت مستقل و پائدار نہیں کی جائے گی تو دربار شاہی کے لوگ جنمیں کم و بیش جاہل و مفتری اور سازش کرنے والے ہوتے ہیں معلم پر تہمتیں تھوپیں گے اور اُسپر بہتان اُٹھائیں گے اُس سے بغض و حسد و بدخواہی کرینگے اور ایسی کوشش کرینگے کہ مربیوں کو استاد پر اعتماد نہ رہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ معلم کی ہر تدبیر کے ناکام رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ استادوں پر جو مربیوں کا اعتماد ہے اسے دور کریں میں اس بات کو بار بار کہتا ہوں کہ اگر مربیوں کو معلم پر اعتبار نہیں ہوگا تو تعلیم کی جان نکل جائے گی۔ تعلیم کی ہر تدبیر جو اعتماد کی کمانی پر چلتی ہے اسکی ناکامی یقینی پہلے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ سٹوک میئر نے جو تعلیم کے اصول عامہ اپنی یادداشت میں بتلائے وہ آیندہ سالوں میں عالیجناب کے

دستور العمل بنے۔ سٹوک میئر نے نرسری (بچوں کی پرورش) کے باب میں جو تجربات میں اپنا کمال دکھلایا ہے اُسکے باب میں حضرت علیا نے لارڈ میلبورن کو لکھا ہے

ونڈسر کیسل ۲۴ مارچ سنہ ۱۸۴۲ء

ہم اِس فکر میں بہت لگے رہتے ہیں کہ اپنی نرسری کا انتظام کیونکر کریں اس میں بالطبع بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ آپ میرے بڑے شفیق مہربان دوست ہیں آپ سے میں اس باب میں صلاح پوچھتی ہوں فی الحال جو نرسری کا بندوبست ہے اس سے یہ کام اچھی طرح نہیں چلتا اسکا بدلا جانا ضروری ہے اب یہ امر کہ وہ کیونکر تبدیل ہو وقت طلب ہے سٹوک میئر کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ ہم اور ماں باپوں کی طرح اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اس سبب سے نہیں کر سکتے کہ ہمارے کاروبار سلطنت اس کے مانع و مزاحم ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ اس کام کے واسطے کسی ایسے شخص کو تلاش کریں کہ جس پر اعتماد کلی کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی والاخطاب عالی جاہ لیڈی کو اس کے ساتھ ایک سب گورنس مقرر کرنا اولی اور انسب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی والاخطاب عالی جاہ عورت کہاں سے دستیاب ہو جو اس خدمت کے لائق اور مناسب ہو۔ اگر وہ مل بھی جائے تو اس میں کلام ہے کہ وہ اس خدمت کو قبول کرے اگر وہ قبول بھی کرے تو مجھے خوف ہے کہ وہ لیڈی یہ خیال کرے گی کہ میں اپنی خدمت میں جواب دہ قوم و پبلک اور ملک کی بہ نسبت مربیوں کے زیادہ ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ اپنے تئیں تو ہمارا جواب دہ جانے اور ہم

ملک و قوم کے جواب دہ ہوں۔ میں خیال کرتی ہوں کہ ادنیٰ درجہ کی لیڈی خیال مذکور نہیں کرے گی۔ مگر اس سے خدمتگزاری و اطاعت کی وہ توقع نہیں ہو سکتی جو ایک ذیجاہ خاتون سے۔ اب آپ اس باب میں اپنی رائے سے مطلع کیجیے" لارڈ میلبورن نے اس سوال کا جواب حضرت علیا کے پاس فوراً بھیجا کہ جس سوال پر حضرت علیا توجہ فرما رہی ہیں۔ اس میں حضور کی مسرت و راحت اور جناب کے بچوں کی بھلائی اور ان دونوں باتوں کے ضمن میں پبلک کی بہبودی ہے۔ میں سٹوک میئر کی رائے کے ساتھ بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ نرسری کے کارخانہ کی مدار المہام کوئی ذی جاہ لیڈی مقرر ہونی چاہیے۔ نیک کردار اور خوش خصال عورت ہی اس اپنی خدمت کا اور اپنے فرائض کا اپنی جواب دہی کا خوب اچھی طرح پورا پورا حق ادا کرے گی فقط

لیڈی لٹل ٹن ملازمہ حضرت علیا میں وہ اوصاف موجود تھے جو اس خدمت کے لیے درکار تھے وہ اپریل ۱۸۴۲ء میں شاہی بچوں کے لیے گورنس مقرر ہوئیں۔ اور آٹھ برس تک اس اپنی خدمت کو عبادت سمجھ کر بجالاتی رہیں جب ان کی عمر بڑی ہوئی اور انھوں نے اپنی باقی زندگی آرام سے بسر کرنی چاہی تو سنہ ۱۸۵۰ء کے آخر میں مستعفی ہوئیں جب وہ اپنے شاگردوں سے رخصت ہوئیں تو وہ غمزدہ ہو کر خوب روئے۔ ملکہ معظمہ سے رخصت کے وقت وہ خود بھی خوب روئیں۔ اور اُن دونوں کے درمیان ایک طرف سے بڑی محبت وعنایت ولطف وکرم عیاں ہوتا تھا اور دوسری طرف

سے احسانمندی و ممنونی و شکر گزاری نمایاں ہوتی تھی حضرت علیا نے ہمیشہ اپنے بچوں کے معلموں اور استادوں کے ساتھ ایسے نئے سلوک کیے ہیں کہ وہ اور ذی جاہ اور عالی مرتبت مستورات کے لیے نمونے ہیں جسے دیکھ دیکھ کر وہ اس کی نقل اُتارا کریں۔ اگرچہ ملکہ معظمہ وقتاً فوقتاً اپنے شوہر سے اپنے بچوں کی تعلیم کے باب میں ہدایتیں پوچھتی رہتی تھیں اور ان کو اپنا دستورالعمل بناتی تھیں۔ مگر خود بھی عجیب و غریب مضامین تعلیم کے باب میں اپنے قلم سے لکھتی رہتی تھیں۔ اپنی یادداشتوں میں دماغ کی تعلیم کے لیے عقل کے روشن کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر دل کی تعلیم کو یعنی نیک اخلاقی کی تعلیم کو دماغ کی تعلیم پر مقدم بتلایا ہے ۴ مارچ سنہ ۱۸۴۴ء کی یادداشت میں تحریر کیا ہے کہ "سب سے زیادہ عمدہ مقولہ یہ ہے کہ جہانتک ممکن ہو بچوں کی تعلیم بالکل سادی اور خانگی ہونی چاہیے۔ حتی الامکان بچے اپنے ماں باپوں کے ساتھ رہیں اور اپنے والدین کی ہر بات پر اعتماد کرنا سیکھیں مگر اس پاس رہنے میں اُن کے سبقوں میں کوئی ہرج نہ واقع ہو۔" مذہبی تعلیم کے باب میں وہ بار بار اپنے دلی شوق سے لکھتی ہیں کہ بچوں کے واسطے یہ بہتر ہے کہ ہر روز ماں کے گھٹنوں پر مذہبی تعلیم ان کو دی جائے۔ یہ بات ان کے معتقدات میں داخل تھی۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں بادشاہی کاروبار سلطنت کا بار انکے سر پر ایسا آنکر پڑا تھا کہ اپنی بڑی بیٹی کی مذہبی تعلیم کا بالکل اپنے ہاتھ میں رکھنا اُن کے لیے ناممکن ہو گیا۔ تو وہ ۱۳۔ نومبر سنہ ۱۸۴۴ء کی یادداشت میں لکھتی ہیں "کہ میری بڑی لڑکی جب نمازیں پڑھتی ہے۔ تو میرے کا معمول

کی کثرت مجھے اُسکے پاس جانے کی مانع و مزاحم ہوتی ہے" لیکن وہ اور عالی جناب دونوں ہمیشہ یہ نگرانی کرتے رہتے تھے کہ اُن کے بچوں کے دلوں پر انگلش کیتھ چرچ کے مسائل مروّجہ کا نقش نہ جم جائے۔ انھوں نے اسی یادداشت میں اپنے بچوں کی تعلیم مذہبی کے باب میں ان کے معلموں کے لیے یہ صاف اصول لکھا ہے جو اُن کی اولاد کے بچپنے کی تعلیم میں کبھی فروگذاشت نہیں ہوا کہ" میری لڑکی کو اول خدا کا اور مذہب کا ادب کرنا سکھانا چاہیے۔ اس کے دل میں عبادت کا اثر پیدا کرنا چاہیے اور اسمیں وہ خالص محبت ہونی چاہیے جو ہمارے آسمانی باپ نے اپنے زمینی بچوں کو اپنے ساتھ کرنے کے لیے دی ہے اس کے سامنے مرنے کے اور مرنے کے بعد جلنے کے ڈرانے اور دل دہلانے والے خیالات نہیں بیان ہونے چاہییں۔ اس کو یہ بتلانا چاہیے کہ ابھی تک معتقدات مذہبی میں اختلاف نہیں ہے اس کے خیال میں یہ بات نہ آنے دینی چاہیے کہ وہ جو سجدے کر کے عبادت الٰہی کرتی ہے اور جو لوگ عبادت الٰہی کے لیے سجدے نہیں کرتے وہ اپنی عبادت میں اس سے کم ہیں اور وہ خدا کی عبادت سے شغل نہیں رکھتے"

شروع ۱۸۴۶ء میں محل شاہی سے باہر پرنس ویلز کی تعلیم کے باب میں مباحثہ شروع ہوا کہ اس کی تعلیم کون شخص کرے۔ اس عنوان کا ایک رسالہ بڑی لیاقت سے لکھا گیا اور وہ شائع ہوا۔ پرنس البرٹ کو اسپر علم ہوا وہ تو اس سوال کے حل کرنے میں سرتاپا محو تھے۔ انھوں نے سٹوک میئر کے ساتھ

مل کر اس کی خوب چھان بین کی سٹوک میر کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ شہزادے کی عمر ایسی چھوٹی ہے کہ ابھی ایسا وقت نہیں آیا کہ اس کی تعلیم کی تفصیل ایسی کی جائے کہ جس میں کامیابی ہو۔ ان اصول کا فیصلہ جس کے موافق اس کی تعلیم ہو جلد نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۴۶ء کو ایک یادداشت لکھ کر اپنے خیالات حضرت علیا اور پرنس البرٹ پر ظاہر کیے۔ اس میں سے وہ مضامین انتخاب کر کے لکھے جاتے ہیں جو سب پڑھنے والوں کو دلچسپ معلوم ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "پرنس ویلز کی تعلیم کے لیے ان اصول کا انتخاب کرنا چاہیے کہ جن سے پرنس میں ایسی لیاقت پیدا ہو جائے کہ جب انگلینڈ کا بادشاہ ہو جائے تو اپنی رعایا کی مروّجہ رایوں کے موافق حکمرانی کرے یا اُن سے مخالف ہو کر فرماں روائی کرے یہ امر تعلیم کے اصول کے انتخاب کرنے میں نہایت ضروری مہتم بالشان ہے یورپ کی رائے تغیر کی حالت میں ہے۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کے جن مسائل کا اور سوسائٹی کے جن قواعد و قوانین کا عروج ہو رہا ہے۔ وہ اس زمانہ میں کہ پرنس بادشاہ ہوگا کیا تو بالکل موقوف ہو جائیں گے یا متغیر ہو جائیں گے پھر وہ بہ تفصیل بیان کرتے ہیں کہ تہذیب کی خاص حالت میں ہمارے پولیٹکل (سیاسیہ) اور سوشیل (معاشرت تمدنی) میں بہت سی باتیں بے قاعدہ اور بے اصول اس نظر سے اختیار کی جاتی ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور سوسائٹی جو بدل رہی ہو اس کے برقرار رکھنے اور تھامنے

کے لیے وہ بڑی ضروری ہوتی ہیں۔ مگر وہ بے قاعدہ باتیں عقل کے نزدیک مہمان چندروزہ ہوتی ہیں۔ بعض تو ان میں سے غائب ہو گئی ہیں اور بعض اس سبب سے قائم ہیں کہ ان کے بدلنے کا وقت ابھی پورا نہیں آیا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر آنے والی واردا تیں پہلے سے اپنا سایہ ڈالا کرتی ہیں تو ہم یقینی کہہ سکتے ہیں کہ برطانیۂ عظم کی سوشل حالتوں میں تغیرات عظیم اپنی نمایان سایہ افگنی کر رہے ہیں۔ اور خود بالذات اُن تغیرات کے آنے میں تھوڑا ہی سا عرصہ باقی ہے۔ اب بڑا سوال یہ ہے کہ پرنس کو ان واردات کے لیے تعلیم کرنا چاہیے۔ جنکے صادر ہونے کا زمانہ عنقریب ہے۔ اس کے دل میں نوعمری کے اندر تمام موجودہ انسٹی ٹیوشنوں کے تقدس کا نقش جما دیا جائے اور یہ سکھایا جائے کہ کسی تغیر کے مقابلہ کرنے کو وہ عبادت اور اپنے ملک کا فرض جانے۔

عقل و دانش کا حکم یہی ہے کہ تعلیم کے لیے اول طریقہ مذکور کا اختیار کرنا اولی ہے اس سے بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں شہزادہ کی تعلیم کسی طرح ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اس کو ایک پرجوش مستحکم بادی بنائے۔ بلکہ اس کو متعلم خاموش گنبھیر و ہر بات کا سمجھنے والا اور باتوں کی تہہ پر پہونچنے والا بنائے۔ اور اس کو یہ یقین واثق ہو کہ پادشا اور رعایا کی بہبودی و فلاح کے واسطے عملی اخلاق کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

اس ملک میں بادشاہوں کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی تبدیلی کے تحکمانہ

پیشوانہ نہیں بلکہ جب معاشرت تمدنی کے جسم میں حرکتیں پیدا ہوں تو اُسکے
لیے آلۂ موازنت و معادلت بنجائیں یعنی کل قوم یا اُس کا بڑا حصہ آگے حرکت
کرے تو بادشاہ کو ساکن کھڑا رہنا نہیں چاہیے۔ بلکہ جب حرکت زیادہ بطی یا
بہت سریع یا بے قاعدہ ہو تو ایسی صورتوں میں شاہانہ قوت کو کام میں
لاکر فائدہ کے ساتھ موازنت و معادلت پیدا کرنی چاہیے۔ سب سے
بہتر تعلیم یہ ہے کہ شہزادہ کو یہ سکھایا جائے کہ خیالات کی آزادی اور
پولٹیکل (سیاسیہ) و اخلاق و مذہب کے اصول صحیحہ کی بالذات قدرت
توانائی سے مستفید ہو اور جب ان باتوں کے بروے کار ظاہر ہونے کا
میدان ہاتھ آئے تو وہ اپنی نیک کرداری دکھائے۔ مذہب کی بابت یہ
بیان کیا ہے کہ قانوناً یہ حکم ہے کہ خاندان شاہی کے ممبروں کے معتقدات
مذہبی انگلینڈ کے کلیسا کے موافق ہونے چاہییں۔ پس شہزادہ کو معتقدات
مذہبی بے چون و چرا سکھانے چاہییں۔" اب آگے بیرن مذکور لکھتے
ہیں کہ ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں
معتقدات مذہبی کے باب میں جو تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں اور آیندہ
زمانہ میں جو تعلیم یافتہ آدمیوں کے دلوں پر سائنس کے مکاشفات
اپنا اثر دکھانے والے ہیں ان دونوں باتوں کے داخل ہونے کے واسطے
ٹھیک وقت پر شہزادہ کا دل کشادہ رکھنا چاہیے۔ یا نہیں؟ سوسائٹی میں
مذہبی خیال رکھنے والے دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ یہ
سمجھتا ہے کہ عیسائی مذہب کا جو وسیع پاک اخلاق ہے وہی بنائ

مستحکم ہے۔ جس پر مذہب کی فوق الفطرت عمارت قائم ہوتی ہے یہ گروہ کثیر ہے گو وہ یہ ظاہر ظاہر بینوں کی نگاہ میں قلیل معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ یہ جانتا ہے کہ عیسائی مذہب کا بیش بہا عنصر مذہب کا فوق الفطرت حصہ ہے وہ پبلک کے دلوں میں اس عنصر کے پھیلانے اور جمانے میں بڑی کوشش کرتا ہے اس میں بہت زیادہ لائق آگاہ دل روشن دماغ بزرگ منش لوگ داخل ہیں۔ اول گروہ کو بڑا بھروسہ و امید ہے کہ نیچر کے علم کے انکشاف سے اور ہماری ہستی کے قوانین فطری کی اطاعت سے سوسائٹی کی ترقی ہوتی جائے گی۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس علم پر در حقیقت خدائے تعالےٰ فرمانروائی کرتا ہے اس اپنی فرماں روائی میں اس نے خود ایک علت و معلول کا نظام باہم توام ہونے کا بنایا ہے جو ساری زمین پر ہر جگہ جاری ہے۔ یہ نظام بالکل سب سے زیادہ پاک اخلاق اور صحیح ہدایت کے احکام کے مطابق ہے اور اس نظام کے موافق خدائے تعالیٰ نے آدمی کی سرشت بنائی ہے اور اس کو اختیار دیا ہے کہ اپنی ہستی کے ہر مرحلہ میں اپنی عقل کے استعمال سے اور اپنے ارادہ کی ترتیب سے اپنی خوشی و رنج کے کام کیا کرے۔ اسی مضمون کو اور الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ خالق نے آدمی کے ہر فعل کے ساتھ نیکی یا بدی لگا دی ہے جو افعال کہ عقل و اخلاق و مذہب کے موافق سرزد ہوتے ہیں اُن کے ساتھ بھلائی وابستہ ہے۔ اور جو افعال کہ جذبات نفسانی و نا انصافی

وخطا کے سبب سے سرزد ہوتے ہیں اُن کا ہر صورت میں نتیجہ بُرا ہوتا ہے
یہ گروہ مانتا ہے کہ انسان کی ہدایت و تعلیم کے لیے سائنس کے مکاشفات
مرضی الٰہی کے الہامات ہیں۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ عوام کے دلوں میں
مذہب کے خرق عادات کے تخیلات کا بسا ہونا اصلی الہامات کی
قدر شناسی کا اور عملاً اُن کے اختیار کرنے کا مانع و مزاحم ہے ہمیشہ
اس کی ایک جنگ علانیہ دوسرے گروہ سے جاری رہتی ہے لیکن
عموماً یہ گروہ مخفی توپ خانوں سے مروّجہ جمہوری مذہبی رایوں پر گولہ
برساتا ہے ہر زمانہ میں مذہب مروّجہ سے انکار کرنے والے ہوتے ہیں
جن کو علی العموم لوگ یہ یقین کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے آدمی
مذہب سے انکار اس سبب سے کرتے ہیں کہ قیود مذہبی کا پابند ہونا
اُن کو پسند نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اپنی خواہشہائے نفسانی کے
موافق کام نہ کرسکیں۔ مگر میں نے جس جماعت کا ذکر کیا ہے اس کے
عناصر اور ہی ہیں۔ ان میں وہ آدمی داخل ہیں جن کا چال چلن نہایت
نیک ہے وہ اپنی سوسائٹی اور گورنمنٹ کے انتظام کے ساتھ
نہایت راست بازی کے ساتھ محبت رکھنے والے ہیں اور نہایت سوچ
بچار کرکے اور دقیق و عمیق تاریخانہ تحقیقات کرکے عیسائی مذہب کے
خرق عادات کے مسائل سے انکار کرتے ہیں۔ بالفعل برطانیہ اعظم میں
پبلک طور پر اِس جماعت کا ظہور کمتر ہوا ہے۔ لیکن میں اپنے مشاہدہ
سے کہتا ہوں کہ یہ جماعت کثیر التعداد ہے اور روز بروز

زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اس میں فقط زمرۂ علما وفضلا وحکما کے بہت سے ممبر ہی داخل نہیں ہیں بلکہ معزز خوش حال کارگر جماعتوں کے اشخاص بھی بہت سے داخل ہیں۔ سائنس کے ہر مکاشفہ کا ہونا اور اس کا اشاعت پانا اس کی قوت کو بڑھاتا جاتا ہے اور اس کا نہایت افسوس و رنج دلاتا ہے کہ معاشرت تمدنی میں سائنس کے استعمال کی ترقی بہت ہی آہستہ ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے اچھے نیک دل ایسے ہیں کہ وہ خرق عادات کے تحکمات سے بھرے ہوئے ہیں اب میں زمانۂ آیندہ پر خیال کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ برٹش سلطنت میں اس گروہ کی رایوں اور مذہبی تعلیموں میں بڑی بڑی تبدیلیاں اور ترمیموں کی تخم ریزی ہو گئی ہے۔ دوسرا گروہ جو خرق عادات کا معتقد ہے وہ اس گروہ سے بڑا اختلاف یہ رکھتا ہے کہ وہ انسان کی سرشت پر اور اس کی قابلیتوں اور استعدادوں پر اعتبار و اعتماد نہیں رکھتا جو عیسائی مذہب کے اصلی ماننے والے کہلاتے ہیں وہ خرق عادات ہی کو اخلاق کی۔ گورنمنٹ کی۔ قوانین کی۔ ان کے ماتحت باتوں کی بنیادیں سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقدس معتقدات و پاک مسائل کے نقشوں کو جمہور کے دلوں پر جمائیں اور وہ اپنے منبروں پر وعظ فرما کر جو کچھ سکھاتے ہیں۔ اس میں نظام عالم کی اس ترتیب و انتظام کی موافقت و مطابقت و موزونیت کا بہت ہی کم خیال رکھتے ہیں۔ اور اس کا بہت زور و شور سے انکار کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ یہ ایسی نمائش گاہ نہیں ہے کہ جس میں عیسائی مذہب کی نیکیاں اپنی جلوہ نمائی کریں۔
اب سٹوک میئر صاحب یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیا اس بات کے سکھلانے میں سلامتی ہے کہ شہزادے کو ان مخالف اعتقادوں اور رایوں کے زور اور وجود سے اس طرح مطلع کیا جائے کہ جس سے مسلمہ عیسائی مذہب کو اور تختِ سلطنت کو صدمہ پہونچے؟ یا اس بات کے سکھلانے میں سلامتی ہے کہ کل مضمون اس کے سامنے کھول کر اس طرح رکھا جائے کہ وہ ہر گروہ کے معتقدات کو دیکھ لے کہ وہ کس بنا پر مبنی ہیں؟ پھر وہ آگے خود ہی اس سوال کو یوں حل کرتے ہیں کہ شہزادے کو اول یہ سکھلانا چاہیے کہ انسان کے محاسن اخلاق اور قوانین عقلیہ وہ مستحکم بنیادیں ہیں کہ جن پر نظام سلطنت و معاشرت تمدنی مبنی ہوتے ہیں۔ پس عام کوشش یہ کرنی چاہیے کہ رعایا میں یہ قوا نشو و نما پائیں اور ان قوا کی ہدایات و اشارات شہزادے کے اپنے اخلاق کے مرشد و ہادی بنیں جس سے کہ اس کی اپنی سلطنت کو تقویت اور اس کی اپنی رعایا کی صلاح و فلاح ہو۔ مختصر یہ ہے کہ شہزادے کو یہ سکھلایا جائے کہ خدائے تعالےٰ نے آدمیوں کی افراد اقوام کے لیے قوانین اخلاق بنا کر ان کی طبائع پر لکھ دیے ہیں جن سے کل انسان کی بہبودی برقرار رہ سکتی ہے۔ پس مقننین و سلاطین کا سب سے اعلیٰ فرض یہ ہے کہ قانون الٰہی کو منکشف کر کے ان کے ضوابط کی

تعمیل کریں۔

حضرت علیا نے اس باب میں اوکسفورڈ کے بشپ ڈاکٹر ولبرفورس اور اپنے طبیب حاذق جیمز کلارک سے جو اپنے زمانے کے بڑے نامور عالم و فاضل متبحر تھے استفسار کیا تو انھوں نے اپنی رایوں کو اس باب میں بڑی فصاحت سے بیان کیا ان کی رائیں اکثر سٹوک میئر کی رایوں سے ملتی جلتی تھیں۔ اُن رایوں کے مجموعہ کی چھان بین سے پرنس ویلز کی تعلیم کے لیے ایک دستور العمل اور ہدایت نامہ مرتب ہوا جس کے موافق شہزادے کی تعلیم شروع ہوئی۔ جس کے نتائج اب تک نیک ظہور میں آئے ہیں۔ اور ان سے زیادہ نیک نتائج آئندہ ظہور میں آویں گے۔

یورپ میں سلطنت جمہوری کی طرف رعایا کی رغبت زیادہ ہوتی جاتی ہے اس لیے بادشاہوں کو سلطنت کرنے میں زیادہ دشواریاں پیش آتی جاتی تھیں مگر ملکہ معظمہ اور عالی جناب نے اپنے بچوں کی تعلیم کا طریقہ وہ دانشمندانہ اختیار کیا تھا کہ سلطنت میں خواہ کیسی ہی دشواریاں پیش آئیں اُن کا سہل کرنا ان کو مشکل نہ ہوگا۔ مسٹر برچ نے ایسی تعلیم کا بیڑا اُٹھایا اور شہزادے کو لٹریچر اور سائنس سکھانا شروع کیا۔

آنریبل جسٹس سید کرامت حسین بیرسٹر ایٹ لا جج ہائی کورٹ الٰہ آباد

آب و ہوا و غذا

تجربہ شاہد ہے کہ آدمی کو تندرست زندہ رہنے کے لیے صاف ہوا خالص پانی اور جیدالغذا کھانے کی ضرورت ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی عمر کا جتنا زیادہ حصہ ممکن ہو صاف ہوا میں بسر کرے۔ دیہات میں یہ بات آسان ہے۔ بڑے شہروں میں مشکل ہے۔ مگر ہر عاقل کا فرض ہے کہ مشوب[1] ہوا سے اتنا ہی بچے جتنا سانپ بچھو یا زہر سے بچتا ہے، مشوب ہوا تندرستی کو بالکل بگاڑ دیتی ہے۔ صاف ہوا کے بعد خالص پانی کا مرتبہ ہے، جہانتک ہو سکے غیر خالص پانی سے پرہیز کرنا فرض عین ہے، آب و ہوا کے بعد کھانے کا مرتبہ ہے، لذیذ اور جیدالغذا کھانا سیر ہو کر کھانا لازم ہے، وہ نافع للذات بھی ہے اور نافع للغیر بھی، اول تو سیر ہو کر کھانے سے جو لذت اور فرحت ہوتی ہے وہ بہت گراں بہا ہے۔ اور جو مدد اس سے تنومند اور صاحب قوت ہونے میں اور اپنی زیست اور ایثار کے افعال کرنے میں ملتی ہے وہ اور بھی زیادہ قابل قدر ہے، ظاہر ہے کہ تمام کاموں کا کرنا تندرستی اور قوت پر موقوف ہے اور وہ دونوں جیدالغذا اور کافی کھانوں پر، اس لیے غذا کی عمدگی اور تنوع علم الاعتدال میں پسندیدہ ہے جس طرح سے جیدالغذا

[1] غیر خالص ۱۲

سریع الہضم اور لذیذ اور گوناگوں کھانا سیر ہو کر کھانا اپنے اور اپنی اولاد اور نوع انسان کی زیست اور صحت اور راحت کے لیے لازم ہے ویسا ہی ردی الغذا بطی الہضم اور بد مزہ کھانا اور ضرورت سے کم اور زیادہ کھانا اپنی اور اپنی اولاد کی اور نوع انسان کی زیست اور راحت وصحت کو مضر ہے۔ طبی اور ذاتی تجربہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ بہ وقت ضرورت اور بقدر ضرورت عمدہ سادہ کھانا سیر ہو کر کھانا راحت سے عمر طبیعی تک پہونچنے میں بہت مدد کرتا ہے اور اولاد اور نوع انسان کی زیست وراحت وصحت میں نافع ہوتا ہے۔ ضرورت سے کم کھانا یا بد مزہ کھانا یا چونی بھوسی پر قناعت کرنا جس کو بعض حضرات خصلت حسنہ گمان فرماتے ہیں، بالکل غلط خیال ہے، ایسا شخص اپنا اپنی اولاد کا اور نوع انسان کا دشمن ہے، ایسا ہی وہ حضرات جو لذت بخش مگر مضر کھانے کو مقصود زندگانی سمجھتے ہیں، سیدھی راہ سے الگ ہیں، لذیذ کھانوں کی افراط میں اول تو اسراف ہے، اسی کے ساتھ امراض ہیں اور اولاد اور نوع انسان پہ ظلم عظیم ہے،

کھانے کے ضمن میں لباس ومکان وسامان مکان کا ذکر مناسب ہے۔

آدمی کو یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ فطرت نے بہت تھوڑی سی قوت آدمی میں ودیعت رکھی ہے، جو کچھ وہ کر سکتا ہے، اسی قلیل قوت

کے صرف سے کر سکتا ہے، اور اُس کا صرف کرنا یا تو فاعل اور دیگر افراد کی زیست کو مفید ہوتا ہے یا مضر، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ نہ مفید ہو نہ مضر، بلکہ عبث ہو، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو دولت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی انسانی قوت کے صرف سے حاصل ہوتی ہے اس لیے ہر فرد کو کسی کام کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا چاہیے کہ وہ کام جس میں فاعل اپنا وقت اپنی قوت اپنی دولت صرف کرتا ہے وہ فاعل اور باقی فردوں کی زیست کے لیے مفید ہے یا نہیں، اخلاقاً انھیں کا کرنا حَسَن ہے، جو مفید ہوں اور انھیں کو فضائل کہیں گے، اور اُن کا کرنا جو مضر ہوں قبیح ہے اور اُنھیں کو رذائل کہیں گے، تمام افراد کو اخلاقاً وہی کام کرنا چاہیے جو زیست کو مفید ہو اور اسی وجہ سے لباس و مکان و سامان مکان وغیرہ میں ہر شخص کو منفعت کو زینت پر ترجیح دینا چاہیے، ایسا ملبوس و مسکن و سامان مہیا کرنا چاہیے جس سے بقدر ضرورت راحت ملے، آرایش اور نمائش فضول سے پرہیز کرنا چاہیے مثلاً لباس میں سادگی فرض ہے اسی کے ساتھ لباس ایسا چاہیے، جو جسم کو چھپائے۔ اور گرمی و سردی سے بچائے اور جسم کو گوارا ہو، بقدر امکان بالکل صاف ہو، ہرگز ایسا چست نہ ہو جس سے اعضا کی فطری ساخت میں فرق آئے۔ اور خون کے دورے میں ہرج ہو ان صفات کے بعد اگر خوشنما ہو تو مضائقہ نہیں۔ لیکن لباس کے گراں بہا اور خوشنما کرنے میں افراط کرنا علم الاعتدال میں بہت قبیح ہے، اوّل تو گراں بہا اور خوشنما کرنے میں بہت سا وقت اور دولت

اور قوت صرف ہوتی ہے، جن سے کوئی حقیقی نفع شخصی اور اہلی اور نوعی زیست کو نہیں پہونچتا، بلکہ ضرر ہوتا ہے، دوسرے لباس فاخر سے انسان دوسروں پر بیجا برتری ظاہر کرکے اُنکے دلوں کو ستاتا ہے تیسرے بجائے اس کے کہ لباس جسم کی حفاظت کرے بہت سا وقت پہننے والے کا لباس کی حفاظت میں صرف ہوتا ہے اور اُس کی زیست پر بُرا اثر پڑتا ہے کاش لوگ سمجھیں اور وہ وقت اور دولت اور قوت جو لباسوں کی مصنوعی خوشنمائی اور گراں بہائی میں صرف کرتے ہیں وہ نوع انسان کے جہل اور رذل اور بدصورتی اور کمزوری اور افلاس اور امراض کے گھٹانے، اور اس کے علم اور شرف اور جمال اور قوت اور دولت اور صحت کے بڑھانے میں صرف کریں۔ اگر عقل سے کام لیا جائے تو اس میں شبہہ نہیں کہ وہ گمراہ اور مضر اور مصنوعی مذاق جو مفرط زرق برق اور گراں بہا لباس کو پسند کرتا ہے، اخلاقی گناہ کبیرہ ثابت ہو، اصل میں ایسا مذاق نوع انسان کے تنزل کے اسباب میں سے ہے، اور جو لوگ اس میں انہماک کرتے ہیں وہ نوع انسان کے دشمن ہیں۔ اگر صحیح تعلیم و تربیت سے ہمارے مذاق کجی کو چھوڑکر سیدھی راہ پر آویں، تو دیکھیں کہ صاحب جمال تندرست باعلم و عمل مرد و عورت سادے اور ستھرے لباس میں پُرتکلف اور زرق برق لباس کی بہ نسبت ہزار گونہ زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جو کچھ لباس کی بابت عرض ہوا، زیور سے بھی متعلق ہے، بدموں روپیہ کا زیور جو دنیا میں اِس وقت ہے، اتنا وقت اور قوت اور دولت صرف کرکے حاصل ہوا ہے

کہ اگر وہ نوع انسان کے اسباب راحت بڑھانے اور موجبات اذیت گھٹانے میں صرف ہوئے ہوتے، تو جس حالت میں دنیا آج ہے، اس سے ہزار گونہ بہتر حالت میں ہوتی۔ کاش۔ آیندہ ہی لوگ سیدھی راہ پر آویں اور اپنی عمر عزیز کو سود مند کاموں میں لگا دیں۔ مکانات بنانے میں بھی منفعت کو زینت پر مقدم کرنا چاہیے، مکان نہایت ہی صاف اور ستھرا ہونا چاہیے، گرمی سردی بارش وغیرہ فصلوں کے لیے موزوں ہونا چاہیے، ساخت ایسی ہونا چاہیے جو ہر وقت کثیف شدہ ہوا سے پاک ہوتا رہے، اس میں نشست، برخاست، غذا، سونے، نہانے کام کرنے وغیرہ کے جُدا جُدا حصے ہونا چاہییں، تاکہ تکمیل حیات و راحت میں پوری مدد دے، اور تمام ضروری سامان راحت و حاجت سے آراستہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے زیادہ تکلف اور تزئین اور شوکت و شان مضر ہے اور اخلاقاً قبیح ہے۔ اس سے زیادہ کیا حیف کی بات ہو گی کہ آدمی سے اشرف المخلوقات کی نہایت ارجمند قوت زمین کے حصوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے اور ان کو مصنوعی صورت دینے میں اس لیے صرف ہو کہ اختراعی اور اصطلاحی مذاق اس کو پسند کرے، اور حقیقت میں شخصی اور اہلی اور نوعی زیست کو اس سے ضرر ہو جن لوگوں نے ایسا فاسد مذاق پیدا کیا ہے اور اس کا نام تہذیب رکھا ہے وہ نوع انسان کے ناعاقبت اندیش دشمن ہیں۔

شمس العلما سید علی بلگرامی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس

عربوں کی علمی تحقیقات کے طریقے

کتب خانہ۔ علمی تحقیقات کے کارخانے اور آلات تعلیم و تحقیق کے لازمی وسائل ہیں، لیکن یہ محض وسائل ہی ہیں، اور ان کا بکار آمد ہونا محض انکے طریقۂ استعمال پر موقوف ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہوا ہو، مگر اس میں خود تحقیق یا اختراع کا مادہ ہی نہو، اور وہ شاگردی کی حالت سے استادی کی حالت کو پہونچ ہی نہ سکے۔ ان ایجادوں اور اختراعوں سے، جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوگا کہ عربوں نے اس علم سے جو اُنھوں نے دوسروں سے اخذ کیا کس قدر کام لیا۔ یہاں ہم محض ان اصول کا بیان کریں گے جن پر اُنھوں نے اپنی علمی تحقیق کا مدار رکھا۔

یونانیوں کی شاگردی کرنے اور اُن کی تصنیفات کو پڑھنے کے بعد انھیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ تجربہ اور مشاہدہ کو عمدہ سے عمدہ کتاب پر ترجیح ہے۔ اگرچہ یہ قول اس وقت ایک قضیہ مسلمہ ہے لیکن پہلے ایسا نہ تھا زمانہ متوسط کے علمانے ایک ہزار برس کی محنت میں اس مسئلہ کو سمجھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے۔ کل محققین یورپ علی الخصوص ہمبولٹ

جنھوں نے عربی تصنیفات کو دیکھا ہے۔ اب اس امر کے قائل ہیں
ہمبولڈ اس کے لکھنے کے بعد کہ علمی ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خود
اور اپنے ارادہ سے یعنی بذریعہ تجربہ حوادث طبعیہ کو پیدا کر سکے بطور
تمثیل لکھتا ہے "عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے
حاصل کر لیا۔"

موسیو سدی یو لکھتے ہیں "دارالعلوم بغداد کی تعلیم میں بہت بڑی بات
یہ ہے کہ اس کی طرز استدلال بالکل علمی اصول پر مبنی تھی یعنی معلوم کے ذریعے
سے غیر معلوم کو دریافت کرنا۔ حوادث کا درست مشاہدہ کر کے ان معلومات
کے ذریعہ سے علل کو نکالنا۔ ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت
ہو چکے ہوں یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے۔ نویں صدی عیسوی
کے عربوں کو یہ پُر نتائج طریقہ معلوم تھا جو سال ہائے دراز کے بعد ہمارے
حال کے محققین کے ہاتھوں میں بڑی بڑی اکتشافات اور ایجادوں
کا آلہ بن گیا۔"

عربوں کا طریقہ تحقیق تجربہ و مشاہدہ تھا۔ برخلاف اس کے زمانہ
متوسط کے یورپ کا طریقہ اساتذہ کے کلام کو پڑھنا اور ان ہی کی رایوں کو
بار بار بیان کرنا تھا۔ ان دونوں میں بہت ہی اصولی فرق ہے اور بلا
اس فرق کو مدنظر رکھے ہوئے ہم عربوں کی علمی تحقیقات کی پوری قدر
نہیں کر سکتے۔

پس عربوں ہی نے علمی تحقیقات میں تجربہ کو داخل کیا۔ اور ایک زمانہ دراز

تک صرف عرب ہی تھے۔ جو اس طریقہ کی قدر جانتے تھے؛ موسیو ڈیلا مبر
اپنی تاریخ ہیئت میں لکھتے ہیں کہ "اگر یونانیوں میں بہ مشکل دو یا تین اجرام
سماوی کے مشاہدہ کرنے والے تھے تو عربوں میں برخلاف اسکے بہ کثرت
ایسے لوگ موجود تھے۔ یونانیوں میں علم کیمیا کا تجربہ کرنے والا کوئی نہ تھا
برخلاف اس کے عربوں میں سیکڑوں تھے"۔

تجربہ کے طریقہ نے اُن کی تحقیقات میں ایک صحت اور جدت پیدا کر دی
تھی جو ان اشخاص کی تحقیقات میں نہیں پائی جاتی جو حوادث کو کتابوں ہی میں
دیکھتے ہیں البتہ ایک ہی علم یعنی علم فلسفہ میں جس میں تجربہ ممکن نہ تھا وہ محض
مقلد رہے ہے تجربہ کے ذریعہ سے جسکو انھوں نے جاری کیا تھا وہ بہت بڑے
اکتشافات اور اختراعات کرنے والے تھے اور جو بیان ان کی علمی تحقیقات کا
ہم نے اس کتاب میں درج کیا ہے اُس سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے تین
یا چار صدی میں اس سے بہت زیادہ اکتشافات کیے جو محققین یونان اس
سے کہیں زیادہ مدت میں کرنے پائے تھے۔ وہ یونان کا علمی ذخیرہ جس کو
مشرقیوں نے عربوں سے پہلے پایا تھا۔ لیکن مدت سے کھو چکے تھے اسے
عربوں نے بالکل بدل کر اپنے اخلاف کو پہونچایا۔

عربوں نے محض اکتشافات ہی کے ذریعہ سے علم کو ترقی نہیں دی۔ بلکہ انھوں
نے اپنے دار العلوموں اور تصنیفوں کے ذریعہ سے اس کی اشاعت بھی کی
اس خاص امر میں جو فائدہ یورپ کو ان سے ہوا وہ فی الواقع غیر متناہی ہے
ہماری کتاب کے اس باب میں جہاں عربوں کے علمی اثر کا ذکر ہے معلوم

ہوگا کہ چند صدیوں تک اقوام عیسائی کے استاد صرف عرب ہی تھے اور محض ان ہی کے ذریعہ سے انھیں یونان و روم کے علوم قدیمہ حاصل ہوئے وہ زمانہ بہت ہی قریب کا ہے۔ جب سے عربی کتابوں کے ترجمے ہمارے دارالعلوموں کی نصاب تعلیمی سے خارج ہو گئے ہیں۔

(از تمدن عرب)

عربوں کے علمی اور ادبی معلومات کے مآخذ

جس وقت عربوں نے اپنی فتوحات شروع کیں دو پرانے تمدن یعنی تمدن ایران اور تمدن حکومت مشرقی کے چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ اس نئی دنیا سے جس میں پیروان اسلام نے قدم رکھا وہ نہایت ہی متاثر ہوئے اور بہت جلد اس دنیا کے علوم و فنون و ادب کو اسی مستعدی کے ساتھ تحقیق کرنے لگے۔ جس مستعدی سے انھوں نے ملک کو فتح کیا تھا خلفائے اسلام نے حکومت کو مستحکم کرنے کے بعد ہی کل بڑے بڑے شہروں میں تعلیم و تربیت کے مرکز قائم کیے اور کل ایسے علما کو جو مشہور تصانیف علی الخصوص تصانیف یونان کا ترجمہ کر سکتے تھے جمع کیا۔

خاص اسباب کی وجہ سے ان علما کا جمع ہو جانا آسان ہو گیا تھا ایک مدت دراز سے یونان و روم کے علوم و فنون ایران و شام میں پھیل گئے تھے۔ جس وقت نسطوری پادری حکومت مشرقی سے نکالے گئے تو انھوں نے عراق عرب میں مقام اڈیسا پر ایک مدرسہ قائم کیا

جس کے ذریعہ سے علوم یونانی کی اشاعت ایشیا میں ہونے لگی۔ جب زینو ایساری نے ایڈیسا کو غارت کیا اُسوقت ان علما کو ملوک ساسانیہ نے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اور اس کے بعد ہی جب جسٹی نین نے ایتھنس اور اسکندریہ کے مدارس کو بند کر دیا۔ یہاں کے اساتذہ بھی ایران میں جمع ہوگئے۔ ان اساتذہ نے کتب یونانی کو جن میں ارسطو اور جالینوس اور ڈیاس کریڈیس کی تصنیفات شامل تھیں سریانی اور کلدی وغیرہ مشرقی زبانوں میں جو اس وقت بہت مروج تھیں ترجمہ کیا۔

جب عربوں نے ایران و شام پر قبضہ کیا تو انھیں وہاں ان علوم یونان کے ذخیرہ کا ایک حصہ ملا۔ عربوں نے ان سریانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا اور جن تصنیفات کا ترجمہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا وہ بھی بہت جلد عربی زبان میں آگئیں اور علوم و ادب کی تحصیل نہایت مستعدی سے شروع ہوگئی۔

عربوں نے بہت دنوں تراجم پر اکتفا نہ کی اکثر نے ان میں سے تصنیفات قدیمہ علی الخصوص یونانی تصنیفات کا اصلی زبان میں پڑھنا اسیطرح سیکھا جیسے انھوں نے کئی صدی بعد اندلس میں زبان لاطینی اور قسطلی سیکھی۔ اسکوریل کے کتب خانہ میں اس وقت عربی۔ یونانی عربی لاطینی اور عربی اسپینی لغات موجود ہیں جن کے مؤلف مسلمان تھے اس ابتدائی زمانہ تعلیم میں جسے اسوقت سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو طالب العلم مدارس میں علوم زمانہ ماضیہ کی تحصیل میں صرف کرتا ہے ہر ایک عرب کی تعلیم ان ہی علوم یونانی و لاطینی کی تحصیل پر مبنی تھی پس عربوں

کے پہلے اُستاد یونانی تھے۔ لیکن خود اُن کی طبائع میں اس قدر جدّت خیال اور تحصیل علم کا ولولہ تھا کہ انھوں نے بہت دنوں اس محض شاگردی کی حالت پر جو یورپ کے لیے ازمنۂ متوسطہ میں کافی سمجھی گئی تھی قناعت نہ کی اور وہ اس محدود دائرہ مقامات سے بہت جلد باہر نکل آئے۔

عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز تر ہے اس خالص امر میں بہت سی اقوام اُن کے برابر ہوئی ہیں لیکن بمشکل کوئی ان سے بازی لے جا سکی۔ جب وہ کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ بنانا ہوا کرتا۔ بڑے شہروں میں ان کے مدارس ہمیشہ بکثرت ہوتے تھے بنجمن دی تو ڈیل جو ۱۱۷۳ء میں مرا ہے بیان کرتا ہے کہ اس نے اسکندریہ میں بیس مدرسے دیکھے۔

علاوہ عام مدارس تعلیمی کے بغداد۔ قاہرہ طلیطلہ۔ قرطبہ وغیرہ بڑے شہروں میں دار العلوم تھے جن میں علمی تحقیقات کے کارخانے رسدخانے عظیم الشان کتب خانے غرض کل مصالحہ علمی تحقیقات کا موجود تھا صرف اندلس میں ستر عام کتب خانے تھے۔

مورخین عرب کے اقوال کے بموجب الحاکم ثانی کے کتب خانہ میں جو قرطبہ میں تھا چھ لاکھ جلدیں تھیں جن میں سے چوالیس جلدوں میں صرف فہرست کتب تھی۔ اس کے متعلق کسی نے بہت درست کہا ہے کہ چار سو برس بعد چارلس عاقل نے فرانس کے شاہی کتب خانہ کی بنا ڈالی تو وہ نو سو جلدوں سے زیادہ نہ جمع کر سکا اور اُن میں سے کتب مذہبی کی ایک پوری الماری بھی نہ تھی۔

از شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل۔ ڈی۔ اڈنبرا پنجاب

(ہماری تعلیم)

کچھ خبر بھی ہے کہ علم نے اس زمانہ میں دوسری شان اختیار کی ہے۔ ہم جو اپنے علوم پر نظر کرتے ہیں، تو اُن کے دو ہی نتیجے پاتے ہیں، یا تو زبان کی تکمیل، یا ذہن کی تشحیذ، (تیزی) سو زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ دونوں نتیجے بے کار ہو گئے۔ جن زبانوں کی تکمیل کے پیچھے ہم عمر کا بڑا حصہ صرف کیا کرتے تھے، اب اُن زبانوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ رہی ذہن کی تشحیذ یعنی "حکمت نظری" اُس کا بھرم حکمتِ علمی نے اُٹھا دیا۔ اور ہم علم کے اعتبار سے بالکل کورے کے کورے رہ گئے زبان کی تکمیل سے جو اغراض دنیوی متعلق ہو سکتی ہیں۔ وہ اب انگریزی کی طرف منتقل ہو گئی ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر اُن اغراض کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں لوگوں نے اسی کو انگریزی کی غرض و غایت سمجھ رکھا ہے اور اسی لیے اس کو سیکھتے ہیں کہ حکام وقت کی زبان ہے اور اُس کے ذریعہ سے اور اسی کے ذریعے سے ہم حکام کے ساتھ بآسانی خیالات کا مبادلہ یعنی عرضِ مطلب، فہم مافی الضمیر کر سکتے ہیں بلا شبہ حاکم و محکوم میں بآسانی خیالات کا مبادلہ بڑی ضروری اور بکار آمد چیز ہے لیکن میں انگریزی کی ٹون کو ذرا اونچا لیجانا چاہتا ہوں حکام کے ساتھ خیالات کا مبادلہ تو انگریزی کے ادنیٰ ترین اور خسیس ترین فائدوں میں سے ہے۔ انگریزی کا اصلی اور عمدہ

فائدہ جو مدنظر ہونا چاہیے یہ ہے کہ زبانِ انگریزی علوم مفیدہ کی کلید ہے یہ علوم یا تو سرے سے ایشیائی زبانوں میں ہیں ہی نہیں۔ یا ہیں بھی تو زمانۂ حال کی تحقیقات کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان قوم اور ملک کو اس وقت اور اُسی وقت مفید ہوگی۔ جب یہ مقصود پیش نظر رکھ کر اُس کو حاصل کروگے غرض یہ ہے کہ علم مقصود بالذات اور زبانِ انگریزی کو اُس کا آلہ سمجھا جائے افسوس ہے کہ اس گُر کو ابھی تک لوگوں نے سمجھا ہی نہیں یا سمجھا ہے تو اُس پر عمل نہیں کیا۔ اور سمجھا اور اُس پہ عمل کیا ہوتا تو اتنے ہی دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہوتی۔ تحقیقات مزید اور ترقی اور ایجاد کا تو کیا مذکور ہے، جو عُلوم زبانِ انگریزی میں مدوّن ہیں اور جس درجہ تک وہ پہونچ چکے ہیں، اُتنے ہی پر کسی نے کچھ عمل کرکے دکھایا ہوتا۔ ہمارے بدنصیب ہندوستان میں میٹرل کی تو کمی نہیں۔ کمی تو اس کی ہے کہ کوئی میٹرل کا ہنڈل (استعمال) کرنے والا نہیں۔ ایک تو نوکری کی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اور نوکری کیمیا اور کبریت احمر ہوتی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سنّو بی۔ اے۔ پاس ہوتے ہیں تو نوّے روٹیوں کے لیے سرگرداں پڑے پھرتے ہیں۔ اور نوّے بھی اب ہیں، کوئی دن جاتا ہے کہ سنّو پاس اور سنّو کے سو پاس حرمان و یاس۔ انگریزی پڑھ کر کچھ فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے نوکری کے خبط کو سر سے نکالو۔ یہ جنون تمھیں نہیں پنپنے دے گا۔ کبھی ان باتوں پر بھی غور کیا کرو۔

کہ مثلاً تمھارے اسی لاہور میں کتنے آدمی ہیں اور ان میں کتنے ہیں جو نوکری سے معاش پیدا کرتے ہیں حساب لگاؤ گے تو فی صد کوئی چوتھے پانچویں درجہ کا ڈیسمل نکلے گا پھر مردم آزاری کے مواقع پاکر شیخی بگھارنے کی تو اَور بات ہے۔ خوشحالی کا ایک سٹینڈرڈ قرار دے لو مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ جس کی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو اُس کو اس زمانہ میں خوشحال سمجھنا چاہیے۔ اب دیکھو کہ خوشحالی کے سٹینڈرڈ کے لحاظ سے نوکری پیشوں میں فی صد کتنے ہیں اور دوسرے پیشوں میں کتنے تو پاؤ گے کہ اس نسبت میں نوکری پیشہ چوتھے پانچویں درجے کے ڈیسمل سے بھی دور ہٹے ہوئے ہیں۔ پس تم انگریزی پڑھ لکھ کر جو ایک نوکری پر دھرنا دو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس عمارت کو جو برسوں کی محنت سے بنائی ہے۔ اپنے ہاتھوں ڈھاتے ہو عقلاً شرعاً کوئی سا پیشہ بھی مبتذل نہیں۔ مبتذل اگر ہے تو وہ آدمی ہے جو دغابازی بے ایمانی سے پیشے کو بدنام کرتا ہے۔ دلپسر دینداری اور نیکی کا پرتو پڑا ہو تو جانو کہ اصلی عزت کیا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[1] لوگ نہ اس لیے نوکری کے گرویدہ ہو رہے ہیں کہ اس پیشے میں تموّل و خوشحالی زیادہ ہے نہیں! بلکہ اس لیے کہ اُن کو اپنے ابنائے جنس پر حکم چلانے اور اُن کو ستانے اور ایذا دینے کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں نے اسی کو عزت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ نیک دل اور دیندار آدمی کی نظر

[1] بتحقیق بڑا بزرگ تمھارا نزدیک اللہ تعالےٰ کے بڑا پرہیزگار تمھارا ہے ۱۲

میں اس سے بڑھ کر کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔ تم تو نصیحت کی بات کو اِس کان سُنتے اور اس کان نکال دیتے ہو۔ تحکّم اور مردم آزاری کو عزّت سمجھو تو نوکری ذریعۂ عزت ہے۔ اور پرائی تابعداری کے اِعتبار سے دیکھو تو وہ ایک طرح کی غلامی ہے۔ کتنی ہی بڑی نوکری کیوں نہ ہو آخر کسی نہ کسی کی محکومی تو اُس میں ہو ہی گی۔ غرض نوکری کو عموماً پیشۂ معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزّت اور ذلّت کسی پیشے پر موقوف نہیں بلکہ عزّت اور ذلّت کا مدار انسان کا اپنا کردار ہے اگر کوئی شخص کسی بڑی خدمت پر مامور ہے اور وہ آمدنی بھی معقول رکھتا ہے اور بڑی شان سے زندگی بسر کرتا ہے حکومت بھی ہے اِختیارات بھی ہیں اور سرکار میں بھی رُشد و رسائی ہے اور وہ ناحق بندگانِ خدا کو ایذا دیتا اور ان کے حقوق تلف کرتا اور رشوت لیتا ہے۔ حقیقت میں وہ سب سے زیادہ ذلیل ہے۔ نہ صرف پبلک کی نظر میں بلکہ خود اپنی نظر میں اور خُدا کے نزدیک لیکن ایک غریب آدمی جو محنت مزدوری سے جائز طور پر معاش پیدا کرتا۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ کوئی اُس کا شاکی نہیں ایسا شخص اصلی عزّت رکھتا اور اُس کا مستحق ہے۔

اِس وقت جو اِس تعمیم کے ساتھ تعلیم ہو رہی ہے۔ اور تعلیم کو اِس سے بھی زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اچھی طرح طالبعلموں کے ذہن نشین کر دینا چاہیے۔ کہ نوکری کے خبط کو سر میں نہ آنے دیں ورنہ تعلیم سے فائدہ کی جگہ اُلٹا نقصان اُٹھائیں گے۔ اور ہمیشہ کے

لئے اپنی زندگی اور نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اور بہت سی زندگیاں جو اُنکے ساتھ وابستہ ہیں سب کو تلخ کر دیں گے۔ میرے اِس بیان سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں کہ میں تعلیم کی طرف سے لوگوں کے دلوں کو اُچاٹ کرتا ہوں میرا مقصود ہرگز یہ نہیں مَیں تو تعلیم کو اور اِسی تعلیم کو جو اِن دنوں ہو رہی ہے۔ ہر فردِ بشر کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجکو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اگرچہ جب تک وہ آئے آئے مَیں دُنیا سے رخصت ہو جاؤں گا مگر مجکو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جبکہ یہی تعلیم شرطِ زندگی ہونے والی ہے اور زندگی سے میری مُراد ہے معززانہ اور مطمئن زندگی۔

میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ تعلیم پا رہے ہیں اور تعلیم تو سبھی کو پانی چاہیے غرض سارے تعلیم یافتہ اگر ایک ہی پیشے پر جھک پڑیں گے۔ گو وہ پیشہ فی حدِ ذاتہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو اس کا ضروری اور بدیہی نتیجہ ہے۔ کہ سب بُھوکوں مریں۔ لوگوں کی ضرورتیں متنوع ہیں اور اسی لیے دنیا میں متنوع پیشے چل پڑے ہیں انسانی ضرورتوں اور پیشوں کے تنوع سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں روزی کی کمی نہیں۔ مگر ہم ایک پیشۂ خاص کے مقیّد ہو کر روزی کو تنگ کر لیتے ہیں۔ اب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوکری کے علاوہ دوسرے پیشوں کے لیے تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعلیم سے تو کبھی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ بھی بے نیاز نہیں ہوا۔ ہاں تعلیم سینہ بسینہ ہوتی رہی ہے یا نقل و تقلید

سے اس زمانے میں یہ نئی بات پیدا ہوئی ہے کہ ایک ایک چیز اور ایک ایک کام علم مستقل قرار پایا ہے۔ مثلاً موسیقی کہ ہمارے ہاں سینہ بسینہ اُس کی تعلیم ہوتی ہے۔ یا نقل و تقلید سے لوگ اُس کو حاصل کرتے ہیں مگر تم نے انگریزی بینڈ بجتے دیکھے ہوں گے کہ اونچی اونچی میزوں کا ایک حلقہ ہے لوگ مزامیر لیے اس کے گرد کھڑے ہیں۔ ہر ایک کے آگے ایک کتاب دھری ہے صدر مقام پر بینڈ ماسٹر کھڑا ہوا باجے بجوا رہا ہے انگریزوں کی ولایت میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ درزی اور حجّام اور موچی اور لوہار تک اپنا پیشہ نہیں چلا سکتا تا وقتیکہ اس نے سبقاً سبقاً اپنے پیشے کی کتابی تعلیم نہ پائی ہو۔ اور یہ بات سب پر روشن ہے کہ یہ ہندوستان کُل باتوں میں یورپ کی تقلید کرتا چلا جا رہا ہے اور تقلید کے بدون اس کو چارہ نہیں۔ یہ تعلیم گو کسی خاص پیشے کی نہ بھی ہو۔ تاہم اس سے اتنی آگہی تو انسان کو ضرور ہو جاتی ہے کہ وہ جس کام کو اختیار کرے گا اس کو کر دکھائے گا اور سلیقہ کے ساتھ کر دکھائے گا۔

خان بہادر مولوی ذکاءُاللہ صاحب

(عزّت و ناموری)

بعض آدمی اپنی لیاقت کا نقش بڑھا کر اور بعض اُس کو توڑ مروڑ کر لوگوں کے دلوں پر مرتسم کرتے ہیں۔ مگر حقیقی و تحقیقی عزّت میں وہی لوگ بازی لیجاتے ہیں جو اپنی لیاقت کا نقش جوں کا توں نہ بڑھا کر نہ توڑ مروڑ کر اوروں کے دلوں پر مرتسم کرتے ہیں۔ اُن کو کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا بعض آدمی اپنے کاموں کی عزّت و شہرت بہت چاہتے ہیں بیشک اس سے اُن کا چرچا بجا زبانوں پر بہت ہوتا ہے مگر دلوں میں اُن کی تحسین کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس آدمی اپنی خوبی کو اس طرح دکھلاتے ہیں کہ وہ بہت تاریک ہو جاتی ہے۔ اور کسی کو نظر نہیں آتی۔ اس لیے اُس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ جو کام تقلیداً کیے جاتے ہیں۔ خواہ وہ کیسے ہی مشکل و دشوار ہوں۔ مگر اس سے وہ ناموری اور عزّت نہیں حاصل ہوتی جو ان کاموں کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جو پہلے کسی نے نہ کیے ہوں یا کیے ہوں مگر ناتمام چھوڑ دیے ہوں یا کچھ اضافہ نہ کیا ہو اگر آدمی اپنے کاموں کو ایسا معتدل بناتا ہے۔ کہ جس سے لوگ راضی ہو جائیں اور اُس کے ساتھ سب متفق ہو جائیں تو اُس کی عزّت کا راگ پورا گایا جاتا ہے جو اہلِ ہمّت ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کے اندر ناکامی کی صورت میں جیسی ذلت ہوتی ہے ایسی

ناکامیابی کی حالت میں عزّت نہیں ہوتی تو وہ اپنی عزّت و آبرو کے حق میں اچھے منتظم نہیں ہوتے۔ ساری عزّت کا مدار اس پر ہے کہ اپنے ہمسر رقیبوں پر آدمی سبقت لے جائے۔ اور سب سے اچھّا کام کرکے دکھلاوے اور اپنے کمال سے ان کو ماہر کردے اسی سے عزت کی چمک دمک الماسِ تراشیدہ کی طرح عکس فگن ہوتی ہے۔ آدمی کے نامور ہونے میں اُس کے ہوشیار عاقل نوکر چاکر بڑے مددگار ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ آدمی کی شہرت کا آغاز گھر ہی سے شروع ہوتا ہے۔ معزّز حاسدوں کے حسد سے اپنے تئیں یوں بچا سکتے ہیں کہ وہ اپنی شہرت سے قطع نظر کریں اور اصل مقاصد کے حاصل کرنے میں پیروی کریں اور اپنے کاموں کی کامیابی کو مشّیت ایزدی سے منسوب کریں۔ اور کہیں کہ اس میں ہماری خوبی و حُسنِ لیاقت کو دخل نہیں فقط تقدیر کی بات ہے بعض حکما نے اِعزاز و ناموری کی ترتیب اس طرح مقرر کی ہے کہ اوّل وہ شخص معزّز و نامور ہے۔ جس نے مذہب یا خُدا کی عبادت کو قائم کیا ہو دوم وہ جنھوں نے کسی سلطنت شخصی یا جمہوری کی بنا قائم کی ہو۔ سوم وہ بڑے سپاہیوں کے سپہ سالار جنھوں نے اپنے مُلک کو فتوحات سے بڑھایا ہو چہارم عالم خواہ وہ کسی علم و فن کے ہوں۔ باعتبار تعداد علوم کے جن سے وہ ماہر ہوں ان کی عزّت کی جائے گی۔ پنجم سب سے آخر صنّاع و کاریگر جن کی شہرت و عزت موافق ان کے ہنر اور صنعت و ذہانت کے ہوتی ہے بعض عزت و ناموری کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک سلطنت سے

متعلق دوم رعیت سے متعلق۔ شاہانہ عزت کی ترتیب یہ ہے اوّل وہ بادشاہ جو بانی مبانی سلطنت اور بہبودی رعایا کے قائم کرنے والے ہوں دوم سلطنت کے بانیِ ثانی یعنے جنھوں نے قوانینِ سلطنت ایسے بنائے اور بتلائے ہوں کہ اُن کے مرجانے کے بعد بھی وہ سلطنت و حکومت کرتے ہوں۔ سوم وہ بادشاہ جو مُلک کو لڑائی اور جھگڑوں سے بچائیں اور ظالموں کے پنجوں سے چھُٹائیں اور غیر ملکوں کی غلامی سے نکالیں۔ چہارم جو لڑائیوں میں عزت کے ساتھ فتحیاب ہو کر اپنے ملک کو بڑھائیں اور دشمنوں کے حملوں سے ملک کو بچائیں پنجم وہ بادشاہ جو عدالت سے سلطنت کریں اپنے عہد کو اچھا رعایا کے لیے بنائیں۔

اب رعیت کے اعتبار سے عزت اور ناموری کی یہ ترتیب ہے کہ اوّل ارا کینِ سلطنت جن کو بادشاہ اپنا دایاں ہاتھ بنا کے اپنے کارہائے بزرگ حوالے کرے دوم اہلِ کار اور کارکن جو بادشاہ کے نائب ہوں اور لڑائیوں میں بڑے کارہائے نمایاں دکھائیں۔ سوم جو بادشاہ کے منھ بہت چڑھے ہوں اور ناک کا بال بنے ہوئے ہوں اور وہ دل سے بادشاہ کے خیرخواہ ہوں۔ اور رعایا کے آزار کا خیال اُن کے دل میں نہ آتا ہو۔ چہارم بادشاہی عہدہ دار جو اپنے کاموں کے لائق ہوں۔ اصل عزت جو سب پر فوقیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے مُلک کی بھلائی اور خیرخواہی میں اپنی جان وقف کر دے مگر

امر شاذ و نادر کسی میں ہوتا ہے۔

(۲) بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک کام میں جو اصل بانی مبانی اُس کا ہوتا ہے۔ وہ عزت سے محروم رہ جاتا ہے اور دوسرا آدمی جو نمودیہ ہوتا ہے وہ اُس کی عزت غصب کر لیتا ہے۔ مثل ہے کہ "چھوٹے کُتّے خرگوش کو دریافت کرتے ہیں اور بڑے کُتّے پکڑ لیتے ہیں"۔

بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ جو چیز بڑی مشکل اور ضروری ہوتی ہے اُس پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی بلکہ اُس سے جو کمتر آسانی اور قدرتی ہوتی ہے اُس کی بڑی تعریف ہوتی ہے اِس کی مثال چھاپہ اور سستا کاغذ ہے۔ اکثر لوگ چھاپہ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ ہزاروں برسوں پہلے سے آدمی اِس سے واقف تھا۔ پومپی کے اور ہرکیولم کے شہروں کے کھنڈروں میں جو روٹیاں نکلیں تو اُن پہ اُن کے پکانے والوں کے نام منقّش تھے۔ مگر چھاپہ کی اِشاعت جب تک نہیں ہوئی کہ کاغذ ارزاں نہیں ہوا اگر کاغذ ارزاں نہ ہوتا تو چھاپہ کا رواج نہ ہوتا۔

(۳) آدمی ایسے مختلف الطبائع ہوتے ہیں کہ ان پر ایک اصول برابر اثر نہیں رکھتا مثلاً ایک وہ لوگ ہیں کہ مذہب کے سبب سے دوسرے وہ جو عزت کے سبب سے نیک کام کرتے ہیں عزت کے معنے ایسے نازک ہیں کہ جب سمجھ میں آتے ہیں کہ نیک آدمی نے اچھی طرح عمدہ تعلیم پائی ہو اور بڑے بڑے معزز آدمی دیکھے ہوں

ور، یا الطبع شریف ہو۔

اوّل ہم کو اُن لوگوں پر خیال کرنا چاہیے جو عزّت کے صحیح معنی سمجھتے ہیں دوم جو غلط معنے سمجھتے ہیں۔ سوم جو سرے سے عزّت ہی پر ہنستے ہیں۔ اوّل سچی عزّت خواہ اُس کا اُصول مذہب سے مختلف ہو۔ مگر نتیجہ و اثر وہی پیدا کرتی ہے جو مذہب پیدا کرتا ہے۔ کاموں کے کرنے کے خطوط خواہ جُدا جُدا ہوں۔ مگر آن کر سب ایک نقطہ پر ملتے ہیں۔ مذہب کے سبب سے جو آدمی نیکی اِختیار کرتا ہے تو خدا کے قوانین واحکام کے موافق اور عزّت کی وجہ سے جو نیکی اختیار کرتا ہے تو وہ انسانیت کی زیب و زینت کے سبب۔ بُرائی سے پابند مذہب خوف کرتا ہے، پابند عزّت نفرت رکھتا ہے اور بدی کرنے کو معزّز اپنی شان میں بٹا لگانا سمجھتا ہے اور صاحبِ مذہب خدا کا ناراض کرنا جانتا ہے۔ پہلا بدی کو اپنی شان کے شایاں نہیں جانتا۔ دوسرا نواہیِ الٰہی میں سمجھتا ہے۔ سینکا نے کہا ہے کہ "اگر خدا بُرائی کا دیکھنے والا اور اُس کی سزا دینے والا نہ ہوتا تو بھی معزّز آدمی بُرائی اس سبب سے نہ کرتا کہ اُس کے کرنے کو پاجی پن و کمینہ پن اور ذلت جانتا ہے۔" عزّت مقدّس بندش ہے۔ بادشاہوں کا آئین ہے۔ اشرافوں کا ممتاز کرنیوالا کمال ہے۔ وہ نیکی کو جہاں دیکھتی ہے اس کی تقویت کرتی ہے۔ جہاں نہیں دیکھتی وہاں اس کی تقلید کرتی ہے عزّت کو چاہیے کہ آدمی لہو و لعب نہ سمجھے جو اصول نیکی کو پیدا کریں ان کو سہارا دینا چاہیے

دوئم وہ جو عزّت کے معنے غلط سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن باتوں کو عزّت ٹھہراتے ہیں یا تو وہ خدا کے احکام کے برخلاف ہوتی ہیں یا ملک کے برخلاف وہ جُرم کے اِنتقام لینے کو عفو کرنے کی نسبت زیادہ معزّز کام جانتے ہیں وہ جھوٹ بولنے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر کوئی اُن کو جھوٹ کا الزام دے تو اُس کے مار ڈالنے کو عزّت جانتے ہیں اپنی عزّت اور جرأت کے کاموں کو نیکی کے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں استقلال اور ثبات و تحمل اِنسان کی ایسی نیکیاں ہیں کہ بغیر اُن کے آدمی کو انسان نہیں کہنا چاہیئے۔ مگر وہ اُن کو ذلیل سمجھتے ہیں اور فقط اپنی درندوں کی سی دلیری کو بڑی عزّت سمجھتے ہیں۔ ایسے بہت سے آدمی ہم میں ہیں جو فقط اِس صفت سعی کے سبب سے اپنے تئیں معزّز جانتے ہیں غرض جو آدمی مروّج فرائضِ انسانی کا خون کر کے اُن کاموں کو معزّز جانتا ہے جن سے خدا تعالےٰ ناراض ہو یا ان سے اجتماعِ انسانی غارت و تباہ ہو تو ایسا آدمی معزّز شمار نہیں ہوسکتا وہ تو ایسا ذلیل ہے کہ اگر پھانسی پر چڑھاؤ تو اُس کے تختہ کو بھی ذلّت ہو بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کے سامنے خدا تعالےٰ کو بُرا کہو تو ہنس کر چُپکے ہو رہیں اگر اُن کے کسی دوست کو بُرا کہو تو بُرا کہنے والے کی جان مارنے کے لیے تیّار ہو جائیں اگر جوئے میں قرض روپیہ لے کر ہاریں تو خیانت کر کے اُس کے ادا کرنے کو عزّت جانیں غرض ایک اصول کے معنے غلط سمجھنے سے ستم برپا ہوتا ہے

تیسرے وہ جو عزت ہی کو مسخراپن سمجھتے ہیں۔ کوئی مذہب کا پابند ہوتا ہے۔ کوئی بدعتی۔ کوئی لا مذہب وہ مذہب کو ایک ڈھکوسلا جانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک سب برابر ہیں اگرہ آدمی جو رند مشرب اوباش ہوتے ہیں وہ عزت کو کچھ خیال نہیں کرتے۔ اس سبب سے وہ بہت شرارت و شیطنت کے کام کرتے ہیں۔ وہ ہر چیز پر ہنستے ہیں وہ عزت کے انعام کو خیالی چیز جانتے ہیں۔ اگرچہ ایسے شخص بعض وقت اچھّی حکومت اور خوب دولت پیدا کر لیتے ہیں لیکن جو شخص عزّت کے دربار میں نیک کاموں کے دروازہ سے داخل ہوتا ہے صرف وہی ملک کی تاریخ کے خطوں میں اپنا نام نیک نامی کے ساتھ ثبت کرتا ہے۔

از شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

مرزا غالب کی اردو نثر پر ریویو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کیا کرتے تھے، مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہرِ نیم روز[1] کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُس وقت بضرورت اُن کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے پس جب اُن کی ہمت مہرِ نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی، اور وہ بھی اپنے طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی ہو گی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

---

[1] یہ نام ہے اُس تاریخ خاندانِ مغلیہ کا جو مرزا غالب نے بہادر شاہ کی فرمائش سے لکھی تھی ۱۲

"مضمحل ہو گئے قوے غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے جہاں تک دیکھا جاتا ہے، مرزا کی شہرت ہندوستان میں جسقدر اُن کی اُردو نثر کی اِشاعت سے ہوئی ہے، ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے، اور اُن کے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ داں اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے، جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی اُن کا لُطف نہیں اُٹھاتا، مگر بطریقِ اِذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں۔ تاریخ نمُریہ (یعنی مہرِ نیم روز) کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے، انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اِس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی چنانچہ بعض اوفشل تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردوے معلیٰ اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے، لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے

قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں، اور تین مختصر رسالے ہیں، جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں، لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب اُس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اِن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لُطف انگیز اُن کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اردوے معلّی میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط اِن دونوں کتابوں کی اِشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اب تک شائع نہیں ہوے۔ مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُن کے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خط کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُنکے بعد کسی سے اُس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب وآداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں، جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں؛ سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اُس کے بعد مطلب لکھتے ہیں، اور اکثر بغیر اِس قسم

کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے آدمی بالمشافہہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے"، اس مطلب کو انھوں نے اس طرح ادا کیا "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے"۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے، اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے، بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں "اے میرن صاحب السلام علیکم! حضرت آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں، نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور

نے مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ مَیں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں مٹھو، ہوش کی خبر لو، تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ، مَیں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ" اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی! جیتے رہو! آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے۔ کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے سنو دلی کی تمام مال متاع وزر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی ہیں،

کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنے سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا، اُسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہِ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصّے لکھے جاتے ہیں اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے، مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں

ہے کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے کہ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے! اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ، اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشل، اور ریلیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں، باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اسکو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو پھر جس رتبہ کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُس کی سمجھ اور

مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے، اس میں اُن کی لڑکی کو۔ جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟ یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں اُن کے بچپن کے زمانے میں اُن کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں۔ "اے مردم چشم جہاں بین غالب، پہلے القاب کے معنے سمجھ لو۔ یعنے چشم جہاں بین غالب کی پتلی چشم جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خان بہادر ہیں، میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو، اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "دیوانخانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت

چار گھنٹے برستی ہے"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سُنو! عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح، اور ایک عالم آب وگل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا، اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانہ سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے؟ اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا، میرٹھ مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہونچا کچھ دن دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا

بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو
ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اِس ماہ ذی الحجّہ میں چھوٹ جاؤں
بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا
مَیں بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ ازخانۂ زنداں بروم سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت
لکھنے کا التزام کیا ہے اگرچہ اس زمانہ میں ایسا التزام تکلف باردہ میں
شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصًا اُردو جو بمقابلۂ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے
ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمل
نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں
وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے عربی اور سنسکرت
زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عمومًا یہ عیب ہوتا ہے کہ
دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ
تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور
اِس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالا یلزم کے
کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے
دوسرے فقرے میں تقریبًا ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی
پہلے فقرہ میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود
خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو

اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اسکی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں۔ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا، یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جواں مرد ایک بار۔ دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا! نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ"

از مقالاتِ جامع

حفظِ صحّتِ رُوحانی

اگر تمھارا دل حصُول فضیلت وسعادت کی جانب مائل اور علوم حقیقی و معارفِ یقینی کے اکتساب پر راغب ہو تو صحت روحانی کی دلیل ہے اِس کو ازبس غنیمت جانو اور ان امور کا اہتمام واجب سمجھو جو اس میل و رغبت کو تمھارے دل میں قائم رکھیں جس طرح صحت جسمانی کی نگہبانی ان اشیا کے استعمال پر منحصر ہے۔ جو موافق مزاج ہوں اسی طرح صحت روحانی کا قیام و دوام ان لوگوں کی صحبت سے وابستہ ہے جو علم و کمال کے ایسے ہی شایق ہوں جیسے کہ تم ہو۔ کیوں کہ دلوں پر کوئی چیز ایسی موثر نہیں ہوتی جیسی جلیس و انیس کی صحبت کارگر ہوتی ہے۔ یہ اثر ایک دِل سے دوسرے دل میں کچھ ایسے مخفی وغیر محسوس طور پر منتقل ہوتا ہے۔ کہ زنہار اس کی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض حرکات مصاحب کی اگرچہ ابتدائے حال میں ناگوار خاطر ہوں الا امتداد زمان اُن کو ایسا دل پسند و خاطر نشیں بنا دیتا ہے کہ وہی حرکات بے اختیار سرزد ہونے لگتی ہیں، اور قباحت اُن کی یک قلم نظر سے مستور ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کی تائید میں ہم ایک تجربہ یاد دلاتے ہیں۔ غالبًا تم نے دیکھا ہو گا کہ وہ چیزیں جن کا درجۂ حرارت مختلف ہو جب باہم متصل ہوتی ہیں تو گرم شے کی حرارت سرد شے کے اندر سرایت کرتی ہے یہاں تک

کہ دونوں کا مزاج یکساں ہو جاتا ہے پس ان اشخاص کی مجالست سے
احتراز کرنا چاہیے جو تمھارے ہم مشرب وہم رنگ نہوں علی الخصوص جو
لوگ شر و فساد میں شہرۂ آفاق اور بے باکی و بد وضعی میں انگشت نما
ہوں۔ اُن کے پرچھانویں سے بھاگنا اور اُن کی ہوا سے بچنا واجب ہے
بلکہ ان کی ہزلیات و مزخرفات کے سننے سے بھی پناہ مانگنا چاہیے کیونکہ
بعض اوقات ایک بیہودہ شعر یا فحش حکایت مستمع کے دل میں ایسا واہی
خیال پیدا کر دیتی ہے جو بدشواری مدت مدید کے بعد رفع ہوتا ہے اور
یہ بات اکثر مشاہدہ کی گئی ہے۔ کہ اچھے خاصے ہوشیار و نیک اطوار
آدمیوں کی طبیعت پر اہل فساد کے کلام نے ایسا زہر چڑھا دیا کہ وہ
ہوائے نفسانی کی ناپاکیوں میں ملوث ہو گئے ہیں پھر نوعمروں اور
ناآزمودہ کاروں کا تو کیا ٹھکانا ہے۔ ان کی بربادی کے لیے ایک جھونکا
بھی کلامِ بد کا کافی ہے۔ سبب یہ ہے کہ نقص جو انسان کی جبلت و
فطرت میں مرکوز ہے وہ اس کو لذّاتِ ظاہری کی طرف ایسا جلد
کھینچتا ہے جیسے بے سہارے چیز کو زمین اپنی طرف کھینچ لیتی ہے
اگر عقل و حکمت انسان کی روک تھام نہ کرتی تو کل نوع انسان انہی بلاؤں میں
مبتلا ہو جاتے اور جو مقدار قلیل نیک کرداروں کی دنیا میں پائی جاتی
ہے۔ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔

البتہ یارانِ موافق و دوستانِ صادق کی صحبت میں بذلہ و لطیفہ سے حظ
اُٹھانا اور اشعار و حکایات دلپسند سے مسرت و انبساط حاصل کرنا کچھ مضائقہ

نہیں ہے بشرطیکہ ہزل محض نہوں بلکہ عقل و حکمت کا کوئی پہلو اُن میں موجود ہو۔ الّا تفریح و خوش طبعی کی عادت کو حدا وسط سے کم و بیش کرنا نہ چاہیے نہ اس قدر زیادہ ہو کہ مسخرگی اور بے حیائی کی نوبت پہونچے اور نہ اتنی کم ہو کہ ترش روئی و تندخوئی تمھاری حرکات سے ظاہر ہونے لگے۔ بہرکیف اعتدال کے طریق کو ملحوظ رکھ کر صحبت احباب میں ہشاش و بشاش رہنا صحت روحانی کے لیے کسی طرح مضر نہیں ہے۔

حفظانِ صحّتِ روحانی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ افعال حمیدہ کو اپنا معمول بناؤ اور اس معمول میں کبھی فرق نہ آنے دو خواہ وہ فکر و خیال سے متعلق ہوں خواہ عمل اور برتاؤ سے اگر احیاناً اس معمول میں کمی کوتاہی پاؤ تو اپنے نفس سے مواخذہ کرو۔ کوئی ادنیٰ فروگذاشت بھی برتاؤ کے وقت تم سے ہو جائے یا کوئی وسوسہ تمھارے دل میں خطور کرے تو تم اس کو جائز نہ سمجھو۔ فوراً اپنے آپ کو نفرین کرو۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان سے جب کوئی لغزش یا خطا ہو جاتی ہے تو اس کا نفس ندامت کی کلفت مٹانے کے لیے اکثر یہ دھوکا دیتا ہے کہ اس لغزش یا خطا کو جوازکا لباس پہناتا اور اس کے روا ہونے کے پہلو کھود کھود کر نکالتا ہے اور تاویلات رکیک سے اپنا برسر صواب ہونا ثابت کرتا ہے۔ اگر یہ فریب اس کا کارگر ہو گیا۔ تو پھر بھاری بھاری خطاؤں کے اقدام پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ پس اول ہی قدم پر اس کو پابزنجیر کرنا اور اس کے کردار کی پاداش دینا چاہیے۔ یاد رکھو کہ یہ

بات بمنزلۂ ورزش کے ہے۔ جس طرح جسمانی ریاضت اخلاطِ فضول کو بدن سے خارج اور اشتہائے صادق پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اپنے اعمال وافعال پر نظر ڈالنا اور بھول چوک پر نفس کو سرزنش کرنا خیالات بد کی بیخ کنی کرتا اور نکوکاری ونیک اطواری کے شوق کو تروتازہ رکھتا ہے۔ اگر تم اپنے نفس کو اپنے اعمال وافعال پر نظر کرنے سے معطل وبے پروا بنالوگے اور ان میں غور وفکر کرنے کی عادت نہ ڈالوگے تو وہ روز بروز کند وسُست ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ تم کو زمرۂ انسان سے خارج کر کے جرگۂ بہائم میں شامل کردے گا۔ اس وقت عوام کالانعام کالقب تم پر صادق آئے گا۔ کیونکہ بھلے بُرے کی چھان بین اور نیک وبد کی تمیز نہ کرنا بہائم کا خاصہ ہے۔

اگرچہ اپنے تمام کاروبار میں غور وفکر کی عادت نہایت مناسب ہے اِلّا ان معاملات میں ایک سرسری توجہ کافی ہے، جو خواہشات نفسانی سے متعلق ہیں۔ مثلاً خوراک۔ پوشاک۔ مکان اور رخت واسباب وغیرہ۔ اِن اشیاء کی زیب وزینت میں زیادہ کد وکاوش یا مصروفیت نہ چاہیے۔ علیٰ ہٰذا ان باتوں میں بھی سادگی برتو جو غیظ وغضب کی قوّت کو حرکت دیں اور انتقام وغلبہ کا ہیجان دل میں پیدا کریں بلکہ اس قسم کی باتوں کو طبیعت پر چھوڑ دو، ان میں خوض وفکر ہرگز نہ کرو۔ کوئی ایسی عادت اختیار نہ کرو، جو مخالفِ عقل ہو۔ اگر احیاناً ایسا اتفاق ہو جائے تو بالضرور اپنے نفس کو سزا دے واجب دو مثلاً کسی شخص کی نسبت کوئی

ناسزا بات تمھاری زبان سے نکل جائے۔ تو فوراً معافی کی خواستگاری
اور اپنی خطا کا علانیہ اقرار کرو تاکہ اس ندامت و شرمساری کی یاد
تمھارے نفس کو آئندہ رو براہ رکھے۔ اگر بے موقع و بے محل کسی پر
غصہ کر بیٹھو تو اپنے نفس سے ایسی مشقت لو جو اس کو ناگوار و شاق ہو۔
جب اس قسم کی مشق و مزاولت کرو گے تو لامحالہ تمھارا نفس اعتدال
کی جانب مائل رہے گا اور حد سے تجاوز کرنے کو مکروہ سمجھے گا۔

اب میں تم کو اس سے بھی زیادہ پر تاثیر عمل کی طرف توجہ دلاتا ہوں
جو ظاہر اسہل الحصول مگر حقیقت میں بغایت دشوار ہے۔ وہ موثر عمل یہ
ہے کہ تم اپنے عیوب کی سراغ رسانی میں ایسے مشغول رہو گویا کہ تم خفیہ
پلیس کے ایک سرگرم ملازم ہو؟ مگر یہ کام سخت مشکل ہے، کیونکہ
ہر شخص اپنے نفس کو بالطبع عزیز رکھتا اور اپنے ہر قول و فعل کو محمود جانتا ہے
بالفرض کوئی نقص اپنا نظر بھی آتا ہے، تو اس میں انسان اپنی معذوری
و مجبوری کی توجیہات ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ پس اپنے عیوب سے مطلع
ہونے کی ایک تدبیر تو یہ ہے کہ کسی برگزیدہ نکوکار سے رسم دوستی
پیدا کرو۔ جب بنائے انس و مودت مستحکم ہو جائے تو اس سے بمنت
التماس کرو کہ وہ تمھارے عیوب نہانی سے تم کو متنبہ کرتا رہے تاکہ تم کو
اُن عیوب سے اجتناب کا موقع ملے۔ جس وقت دوست صادق تمھارا
عیب ظاہر کرے تو نفرت و کراہت کو دل میں جگہ نہ دو بلکہ
نہایت کشادہ دلی اور تحمل سے اس کی بات سنو اور تہ دل سے

اُس کا شکریہ ادا کرو۔ اداے شکر کا ثبوت یہ ہے کہ جس عیب کی طرف دوست نے اشارہ کیا ہے۔ پھر کبھی اس کا نام نہ لو۔ جب تم ایسا کروگے تو وہ یقیناً تمہارے عیوب کے اظہار میں مضائقہ نہ کرے گا، چنانچہ طبیب مداواے مریض پر اسی وقت توجہ کرتا ہے، جب کہ اسکو اپنے احکام کی تعمیل پر آمادہ پاتا ہے۔

اگر عیب جو، نکتہ چیں دوست میسر نہ آسکے، تو دشمن ہی سے یہ فائدہ حاصل کرو، کیونکہ دشمن تو خود ہی تمہاری عیب جوئی کے درپے رہتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ تمہارا بخیہ اُدھیڑتا ہے، جس کے تم مستحق ہو۔ دشمن کی بدبینی اور نکتہ چینی سے منفعت حاصل کرنے کے لیے غور وانصاف کی نہایت ضرورت ہے۔ جب اُس کی بات سنو، تو منصفانہ تنقیح کرو کہ وہ کہاں تک سچ کہتا ہے۔ اگر فی الواقع وہ عیب جس کا پتہ دشمن سے معلوم ہوا، تمہارے نفس میں موجود ہے، تو اس کی واجبی اصلاح کرو، اور خدا کا شکر بجالاؤ کہ اس نے دشمن کو تمہارے حق میں دوست کا قائم مقام بنا دیا۔ حکیم جالینوس کا قول ہے کہ نیک لوگوں کو اعدا کی عداوت سے کبھی ضرر نہیں پہونچتا، بلکہ موجب انتفاع ہے۔

دوسرا طریقہ عیب ونقص سے برائت حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اور لوگوں کے عیوب پر غور وتعمق سے نظر کرتے رہو، اور جو عیب اپنے ابناے جنس میں پاؤ اس کو اپنا ہی عیب سمجھو، اور اپنے نفس کو اس سے پاک رکھنے میں اہتمام تمام وجہد بلیغ کرو، بلکہ دانا دل اور روشن ضمیر آدمی تو

حیوانات مطلق کے عادات و خواص کو بھی نظرِ عبرت سے دیکھتے اور پند پذیر ہوتے ہیں۔

صحتِ روحانی کی حفاظت کا ایک عمدہ اصول جس پر جمہور حکما متفق ہیں یہ ہے کہ اوقات شبا روزی کے درمیان جو افعال و اعمال تم سے ظہور میں آئے ہوں، اُن کی مکمل فہرست اور مفصل روزنامچہ خود اپنے روبرو پیش کرو اور اُس پر حاکمانہ نظر ڈال کر اپنے نفس سے امورِ ناپسند کی نسبت عتاب و خطاب کرو۔ ایسا کرنے سے تمھارا نفس روز بروز ہوشیار ہو جائے گا اور تمھاری صحت روحانی زوال و اختلال سے محفوظ و مصئون رہے گی۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اصول مفیدہ کا صرف سمجھنا سوچنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ حقیقی فائدہ جب ہے کہ عین وقت پر درستی و راستی کے ساتھ اُن کو عمل میں لا سکو، ورنہ جو علم مقرون بہ عمل نہ ہو۔ بد تر از جہل ہے۔

محمد اسمٰعیل

مولوی سجاد مرزا بیگ (علیگ)

فرض

انسان دنیا میں مطلق العنان نہیں پیدا کیا گیا بلکہ طرح طرح کے علائق کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ جس طرح یہ تعلقات مختلف ہیں اسی طرح اُن کے برتاؤ میں بھی اختلاف ہے اور ہر ایک کے واسطے ایک خاص لحاظ کی ضرورت ہے اگر یہ لحاظ برقرار نہ رکھا جائے تو قاعدۂ عدالت منحرف ہو جائے گا اور دنیا میں بے امنی۔ پریشانی اضطراب پھیل جائے گا۔ انسان کا دل تو بہت چاہتا ہے کہ بندشیں جس قدر کم ہوں بہتر اور نہ ہوں تو بہت ہی بہتر وہ آزادی کو نہایت پسند کرتا اور فرائض و ذمہ داری کے مارے گھبراتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ قدرت نے اُسے فرائض کی بندشوں میں جکڑ دیا ہے اور بہبودی اور تسکین خاطر اور ترقی اور امن کا مدار فرائض اور باہمی تعلقات کو باحسن الوجوہ انجام دینے پر مبنی رکھا ہے انسان کا اپنی ذمہ داریوں کو عمدہ طور سے انجام دینا ہی ایک ایسی صفت ہے جو اس کو اشرف المخلوقات کے معزز خطاب کا مستحق بناتی ہے اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو جس قدر زیادہ عمدگی سے ادا کرے وہ اُسی قدر اور لوگوں کی نسبت زیادہ اشرف اور زیادہ عالی رتبہ ہے کیونکہ اپنے فرائض کو باحسن الوجوہ انجام دینے کا خیال انسانی زندگی کا پایہ بلند کرتا ہے اور اس کے

عادات وخصائل میں ایسی استعداد وصلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مرتبہ بمرتبہ ترقی کرجاتا ہے اور اُس عروج پر قائم رہ سکتا ہے جو اس طرح حاصل ہوا ہے۔ علاوہ ازیں روزمرّہ کے ضروری کام بھی خوبی اور خوش اسلوبی سے پُورے ہوتے ہیں۔ رُوزمرہ کے یہ چھوٹے چھوٹے دیکھنے کو تو معمولی بات معلوم ہوتے ہیں لیکن بڑے ضروری ہیں اور ان کی انجام دہی پر ہی انسان کی تمام بہبودی کا مدار ہے۔

دُنیا میں انسان کے مختلف تعلقات ہیں اور اسی سبب سے مختلف قسم کے فرائض ہیں۔ سب سے اوّل تو خداوند عزوجل پر ایمان لانا اُس کے احکامات کا ادا کرنا فرض ہے جو دنیوی اور اُخروی بہبودی کا سرچشمہ تمام حُسن اخلاق اور حُسنِ معاشرت حُسن تمدن اور حُسن سیاست کی بُنیاد ہے۔ اِس کے بعد اپنی ذات کا فرض ہے۔ اُسے دنیا میں خوار و ذلیل نہ کرے بلکہ اُس کی پرداخت کرنی اور اپنی عزت کا خیال رکھنا چاہیے ہم اپنی ذات کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا اُس کا مالک ہے پس اس کی امانت یا اس کے عطیہ کو خراب اور رسوا کرنا بددیانتی یا کفران نعمت ہے اِس کے بعد ماں باپ۔ بھائی بہن۔ میاں بیوی۔ قریب و بعید کے رشتہ دار ہیں اور دیگر ابنائے جنس جن کے ساتھ ذاتی تعلقات زیادہ ہوں مثلاً ہمسایہ اُستاد و شاگرد۔ دوست واحباب۔ آقا و ملازم بادشاہ و رعیت۔ ہم وطن۔ اہل ملک وغیرہ۔

ہر وقت اور ہر موقع پر یہ جاننا کہ یہ فرائض کیا کیا ہیں اور وہ کون کون سے اُمور ہیں جن پر عمل کرنے سے حصول سعادت و معاش و معاد کی درستی اور سوسائٹی میں امن و صلح قائم ہو کہ ہر شخص حسب استعداد کمال اور مدارج عُلیہ حاصل کر سکے عقل کا کام ہے اِسی واسطے انسان کو عقل عطا کی گئی ہے۔ اگر انسان اپنے فرائض کا خیال نہ رکھے تو بہت جلد رتبۂ انسانیت سے گر کر بہائم میں جا ملے گا ادائے فرض ہماری مصیبتوں کو کم۔ ہماری سہولتوں کو زیادہ۔ ہمارے مراتب کو اعلےٰ کرتا ہے۔ ہر کام اور ہر موقع پر اپنا فرض ادا کرنا دشوار ہی نہیں۔ بلکہ انسان کے حق میں عین راحت اور سہولت ہے۔ کیونکہ دنیا کے تفکرات اور پریشانیوں سے اس کی بدولت نجات ملتی ہے۔ جب لالچ یا کمزوری کا سامنا ہوتا ہے تو ادائے فرض کا خیال ہی قائم اور مستقل رکھتا ہے نا جائز وسائل سے اکتساب دولت، طلب جاہ، جھوٹی شہرت زندگی کا مآل یا فرض اِنسانیت نہیں، بلکہ فرض انسانیت یہ ہے کہ اِنسان دنیا میں اکتساب سعادت اور مفید و بکار آمد کام کرے اور یہی خیال زندگی کے راستے کو صاف و سہل کرتا ہے۔

اطاعت کرنا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا۔ مشکلوں کی برداشت کرنا۔ خطرات کا مقابلہ کرنا۔ محنت پر قائم و مستقل رہنا سکھاتا اور بے اطمینانی و تلون مزاجی کو روکتا ہے اور جو مفید کام ہم کر رہے ہیں۔ یا جو ہمیں کرنا چاہیے اُس پر کاربند رکھتا ہے۔

بُرائی سے بچنے اور بھلائی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور حقیقی خوشی اور علوِ مرتبت کا جوش طبیعت میں پیدا ہوتا ہے صرف اسی سے ناامیدی دور رہ سکتی ہے۔ اور افسوس و حسرت نہیں اُٹھانی پڑتی کیونکہ ایسے شخص کے پاس خواہ دولت اور قوت میں سے کچھ بھی نہ ہو لیکن اس کا دل مضبوط ہوگا اور اس کی روح بشاش اور قلب مطمئن رہے گا جو قارون کے خزانہ سے بھی زیادہ قیمتی ہے جو شخص دنیا میں اپنے فرض کو ادا کرتا ہے وہ اُس منشاء کو پورا کرتا ہے جس کے لیے خُدا نے اُسے اِس دنیا میں پیدا کیا ہے۔ اور اِس قانونِ فطرت (فرض) کی بجاآوری انسان کو اِتنا سہارا دیتی ہے کہ وہ اپنے اوجِ مرتبہ سے نہیں گرنے پاتا اور اگر یہ نہ ہو تو مصیبت۔ افلاس۔ لالچ کا ایک ذرا سا اِشارہ اُس کو گرا کر خاک میں ملا دیتا ہے اداے فرض انسان کو ایسی قوت و طاقت و پائداری و اُستواری بخشتا ہے جیسے چونہ اور پتھر عمارت کو مستحکم اور قائم کرتے ہیں۔ فرض انسان کی اخلاقی عمارت کو پائدار بناتا ہے ورنہ کچی دیوار کی طرح ساری قوت، ساری طاقت، ساری شہرت، ساری ذکاوت، ساری مسرت، بلکہ محبت بھی ڈھ جاتی ہے جس طرح کشش اتصال کے مٹ جانے سے کسی چیز کے ذرّے پریشان ہو جائیں اداے فرض کا خیال جاتے رہنے سے سارے اخلاق کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

شرطِ ہمت یہ ہے کہ اِنسان اپنا فرض ہر خطرہ ہر نازک حالت میں

حتی کہ نا اُمیدی کے مقابلہ میں بھی نہ چھوڑے اور سچ یہ ہے کہ اگر فرض منصبی اچھی طرح ادا کیا جائے تو خواہ ناکام ہی کیوں نہو مگر وہ ناکامی نہیں خیال کی جا سکتی۔ یہ کیا کم ہے کہ انسان نے ذمہ داری کا بوجھ ٹھیک ٹھیک اُتار دیا۔

جن لوگوں کے دلوں میں پابندی اُصول کا اعلیٰ خیال ہے وہ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے کے پیچھے ایسی چیزوں کو بھی قربان کر دیتے ہیں جن سے اُن کی محبت یا دلبستگی ہو۔ میدانِ جنگ میں باپ بیٹے کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھتا ہے اور اس کی شجاعت کی داد دیتا ہے سپاہی ماں باپ بیوی بچوں کے چھٹنے اور گھر بار لٹنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر جان پر کھیل جاتا ہے اور مردوں کی فہرست میں نام لکھواتا ہے۔ انسان کی بڑائی اِس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے واسطے تمام جہان کی نعمتیں جمع کرے اور رات دن رنگ رلیاں منائے یا یہ کہ شہرت و ناموری کے پیچھے پڑے یا کسی ایک مقصد کو دل میں جگہ دے کر اس میں ترقی کا خواہاں ہو۔ اپنی جان کی حفاظت کرنا یا کسی طرح اپنی ناموری چاہنا معمولی باتیں ہیں۔ بلکہ انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دے۔

کئی باتیں ہیں جو فرائض کے ادا کرنے میں ہارج ہوتی ہیں عزم میں تصمیم اور استقلال نہ ہونا اور طلب صادق اور قوتِ فیصلہ

قوی نہ ہوتا۔ انسان پر ایک طرف تو نفس ناطقہ اور بھلے بُرے کی تمیز کا اثر پڑتا ہے دوسری طرف تن آسانی خود غرضی لہو و لعب اور دیگر خراب جذبات اثر ڈالتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر تک اِس تذبذب میں رہتا ہے کہ ان میں سے کسے اختیار کروں اور پھر دونوں میں سے ایک کی طرف جُھک جاتا ہے اگر خدانخواستہ کمینہ جذبات اور خراب خواہشات غالب آگئیں) تو آدمی رتبۂ انسانیت سے ذلت وخواری کے قعر میں گر جاتا ہے اور اگر نفس ناطقہ نے سنبھال لیا تو طبیعت کی قوت اور روحانی مسرت کا جوش اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ ناپائدار اور فانی روکیں جو عدم استقلال کے سبب پیدا ہو گئی تھیں دور ہو جاتی ہیں اور انسانیت کا پایہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس واسطے عادت کو سنوارنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ انسان ہمیشہ صحیح راستہ پر چلے اور اس کے لیے کوئی وقت اور روک نہ پیدا ہو۔ ہر ایک کام کرتے وقت یہ سوچ لینا چاہیے کہ :۔

واقعی اس کا ارتکاب درست ہے یا ناجائز۔ عمدہ کام کرنے کی عادت اختیار کرنے اور خراب میلان کو روکنے۔ خواہشات اور شہوانی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تھوڑے دن تک متواتر سختی اٹھانی اور طبیعت پر جبر کرنا پڑے گا۔ لیکن جب عادت راسخ ہو جائے گی اور جو کام کہ عقلاً و نقلاً کرنا فرض ہے اس کو پورا کرنے کے لیے طبیعت

میں آمادگی پیدا ہوئے گی تو پھر فرائض کے ادا کرنے میں ذرا بھی دقت نہ معلوم ہوگی۔

جس قوم میں اپنے فرائض ادا کرنے کا خیال زیادہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ معراج ترقی پر رہتی ہے اور جب تک یہ خیال قائم رہے آیندہ ترقی سے نا اُمید نہ ہونا چاہیے۔ لیکن جب کہ لوگوں میں من حیث القوم فرض ادا کرنے کا خیال مٹ جائے اور یہ قوت دلوں میں سے جاتی رہے اور وہ تن آسانی یا خودغرضی میں پڑ جائیں تو اُس قوم کی حالت پر افسوس ہے اور اس کا تنزّل اور بربادی کچھ دور نہیں ہے۔

سجاد مرزا بیگ

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے شہسواری، تیراندازی اور راستبازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی مگر کیا اچھی بات ہوتی، اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راستبازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ کا دیوزاد آکر اُن کے دلوں پر تیشۂ جادو مارتا تھا۔ تو یہ اس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اِس میں شک نہیں کہ دنیا بُری جگہ ہے! چندروزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، جو اس مُشت خاک کو اُس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں اور انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکرنا پڑتا ہے کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے جب لقمہ رزق کا پاتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے مزے دنیا کے ہیں، کہ مکر و دغا اُن کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہوجاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو

کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سُننے والے بھی کم ہیں، کیونکہ خوشامد جس کی دُکان میں آج موتی برس رہے ہیں اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا۔ اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار اُمید کا بھوکا آقا کو خوش کرکے پیٹ بھرتا ہے، دوست کی محبت کا بندہ ہے، اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک ہیں، انھیں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے اسی طرح جب جلسوں میں نمودیئے گدھوں کے دعوے، بُل ڈاک کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔ تو۔ اُن میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جنھیں کچھ اُمید کچھ ڈر، کچھ مروّت ہے۔ غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جُھوٹ کی عملداری دُور دُور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوّت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی، اور خود اس مردار سے متنفر ہیں۔ وہ بھی اس کے حامی ہوکر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ

اُس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا ہی نہیں معلوم ہوتا، اصل یہ ہے کہ حضرتِ انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں، جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے جو بات پسند نہیں آتی اُس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سُنتے ہیں اُس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفّر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچّوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوف نے ہوش سنبھالا، تو اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی جب اُنھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی، اسے نیک اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا۔ اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اُس کی ماں تھی اگرچہ اسے دربار میں

آنے کی اجازت نہ تھی مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو اُن کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اُس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا۔ کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مِل گیا تھا یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اُسے حسد کی آگ نے بھڑکایا چنانچہ وہاں سے چُپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا، جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے۔ تو چونکہ بزرگان آسمانی کو اُن کی دشمنی کی بُنیاد ابتدا سے معلوم تھی سب کی آنکھیں اِدھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا، چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیت کے دعوے تھے۔ اُٹھی، اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی اسی واسطے بلند اُٹھی، اکیلی آئی، اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی ہاں آگے آگے فتح واقبال۔ نُور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے اور ایک پری پرواز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے۔ شریک نہیں، ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا۔ دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔

ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سانگ بھرتا تھا، تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں، اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا اسی لیے لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کے حکم اُٹھاتا تھا ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا تھا۔ مگر تھم نہ سکتا۔ **ہوا و ہوس** اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت **دروغ دیوزاد** اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جاکر غل مچانا شروع کردو ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ، دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار۔ بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس

دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا، اور باوجود اسکے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو، میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا مگر وہ بھی بادہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا، دمبدم جگہ بدلتا تھا۔ کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اُس کی طرف سر ہوتا تھا۔ تو جھٹ تاڑ جاتا تھا، ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خُود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک بے حیائی کی ڈھال منھ پر لے ہوا وہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی، مگر سانچ کو آنچ نہیں زخم جلد بھر آتے تھے، اور جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں،

اس لیے دھوکہ بازی اور شبہ کا [illegible] کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو [illegible]س طرح کے اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہ صداقت جو خط مستقیم میں ہے اس سے کہیں نہ ٹکرائے چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی کے رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

اِن رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے چھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے۔ کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں ؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا ادھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سنیں گے اسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گذارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں

اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں کہ ملکہ
کی خدمت آگے بڑھتی تھی۔ مگر بہت تھوڑی۔ اسپر بھی یہ دشواری تھی
کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بدعملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس
جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتی تھی ہرچند
ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیونکہ اس کا زور
کسی کے بس کا نہ تھا۔ مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی
تھی اور اس میں سوا مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور
شجاعت کا نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی۔ اور دل ہی دل میں پیچ و تاب
کھاتی تھی، جب سب طرح ناامید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے سلطان
آسمانی کو لکھا کہ مجھے آپ اپنے پاس بلا لیجیے دنیا کے لوگ اس
شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں ان ہی میں رہا کریں
اپنے کیے کی سزا پالیں گے سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھکر
بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا
اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اُٹھا تو جہان اندھیرا اور تمام عالم تہ و بالا
ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اسکے
یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں
مصیبت میں گرفتار رہے اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں
کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔ اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے۔
(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرمانروائی دنیا میں

ہر دل عزیز نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو۔ اور اسے بھی اِن تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ ورحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کرکے اسقدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعوؤں کا دھواں اسقدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اُٹھانے پڑے ہیں کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور اصلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے، جب تک یہ نہ ہوگا، لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے، اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اُس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں انھیں سوا عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی دوسرے وہ خود بہروپیا ہے، جو صورت سب کو بھائے، وہی بہروپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے، غرض

اہل انجمن نے صلاح کرکے ملکہ کے طرز لباس بدلنے کی تجویز کی، چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا۔ اِس جامہ کا مصلحت زمانہ نام ہوا، چنانچہ اِس خلعت کو زیب بدن کرکے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی جس ملک میں پہونچتی، اور آگے کو رستہ مانگتی ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے، اِدھر اِس کا دخل ہوا اُدھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا جامے کے اُترتے ہی اُس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب بھی وقت آگیا ہے یعنے جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کرکے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہونچکر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے، جب تبدیل لباس کرکے وہاں جا پہونچتا ہے تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

شمس العلما مولوی نذیر احمد ایل۔ ایل۔ ڈی (اڈنبرا)

شہنشاہی دربار تاجپوشی میں حضور وائسرائے کی تقریر دلپذیر

ہز اکسلنسی وائسرائے کرسی سے اُٹھکر اہل دربار کی طرف متوجہ ہوئے اور تمام مجلس پر ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا پھر آہستہ آہستہ اور نہایت اطمینان کے لہجے میں جناب ممدوح نے یہ سپیچ فرمائی جسکو دور سے دور کے تماشائی بھی جو ایمفی تھیٹر کے کنارے پر جمے ہوئے تھے بخوبی سُن سکے اگرچہ اِن کا فاصلہ ۱۳۰ گز کا تھا۔

اے شہزادگان والا تبار و رؤساء عالی وقار و متوطنان مملکت ہند! پانچ ماہ کا عرصہ ہوا کہ بادشاہ انگلستان و شہنشاہ ہند اڈورڈ ہفتم نے لندن میں انگلستان کا تاج شاہانہ سر پر رکھا اور عصائے حکومت کو دستِ مبارک میں لیا۔ اُس وقت مملکت ہند کے صرف چند ہی وکیل اپنی خوش قسمتی سے حاضر تھے۔ لیکن آج شہنشاہِ معظم نے اپنے الطاف خسروانہ سے تمام اہل ہند کو یہ موقع دیا ہے کہ ایسی خوشی میں شریک ہوں اور آج یہاں یا ہند کے دیگر حصص میں اس عالی شان تقریب کی خوشی میں کل رؤسا و امرا و سردار جو عمائد سلطنت ہیں اور تمام دیسی و یورپین حکام جن کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہے اور جو ایسی دانائی اور جانفشانی سے کام کررہے ہیں۔ جس کی نظیر نہیں ملسکتی اور کل انگریزی اور دیسی فوج جو ایسی نہایت اعلیٰ درجہ

کی بہادری سے سرحد کی حفاظت کرتی ہے اور لڑائیوں میں اپنا خون بہاتی ہے اور تمام باشندگان ہند بلا امتیاز ملت اور اپنے رسوم و رواج کے جو باوجود لاکھوں طرح کے جھگڑوں کے سلطنت برطانیہ کی اطاعت کے اظہار میں یک زبان ہیں، جمع ہیں صرف اس غرض سے کہ میں اعلیٰ حضرت کی رسومات تاجپوشی کو ہندوستان میں ادا کروں۔ حضور ملک معظم نے مجکو بحیثیت وایسرائے کے اس دربار کے منعقد کرنے کا حکم دیا ہے اور صرف اس امر کے اظہار کے لیے کہ اعلیٰ حضرت کی نظروں میں اس دربار کی بڑی وقعت ہے۔ اُنھوں نے اپنے برادر حقیقی ہز رائل ہائنس ڈیوک آف کاناٹ کو اس جلسے میں شریک ہونے کی غرض سے روانہ فرما کر ہم کو عزت بخشی "

"چھبیس سال ہوئے کہ آج ہی کے دن اور اسی شہر میں جو ہمیشہ سے شاہانہ جلسوں اور دیگر رسوم کا مرکز رہا ہے۔ اور اسی مقام پر ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے خطاب قیصر ہند اختیار فرمانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس دربار سے ملکہ آنجہانی کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ اپنی گہری محبت کا اظہار مقصود تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلانا تھا کہ اب سلطنت انگریزی کے سایہ میں ان کے باہمی نفاق فرو ہو گئے اور وہ سب یک جہت ہیں ہم آج خدا کے فضل سے ایک چوتھائی صدی کے بعد بھی پہلے سے کہیں زیادہ متفق ہیں۔ یہ شہنشاہ

جس کے اظہار اطاعت کے لیے آج ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ اہل ہند کی نظروں میں کچھ کم عزیز نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھا ہے اور اپنے کانوں سے اُن کی آواز سنی ہے وہ اب اس تخت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ جو صرف شان دار ہی نہیں بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ دیرپا ہے اور وہ حقیقت میں انگریزی سلطنت ہے جس کی بڑی قوت ہندوستان کی مقبوضات رعایا کی جاں نثاری حضور ملک معظم کی اطاعت پر مبنی ہے اور جو معترض اس سے منکر ہے وہ بالکل نادان ہے جیسا کہ ہندوستان اپنے قدیم افسانوں سے مالا مال ہے۔ ویسا ہی وہ اپنی خصلت وفاداری پر نازاں ہے جس کو مغرب نے از سرِ نو مشتعل کر دیا ہے مختلف صدیوں میں ہزارہا لوگوں نے ہند کی خواستگاری کی مگر اس نے اپنے تئیں ایسی سلطنت کے حوالے کیا جس کو اس کی وفاداری پر پورا اعتماد تھا۔"

"تماشا جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں دنیا میں ایسا اور کہیں ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ میرا مطلب اس وقت اس عظیم الشان اژدحام سے نہیں جس کو میں بے نظیر خیال کرتا ہوں بلکہ میری مراد اس مجمع کی غرض اصلی سے ہے اور ان اصحاب سے جن کے دلی ولولوں کا یہ اظہار کر رہا ہے سنو سے زیادہ مختلف ریاستوں کے حکمراں جن کی رعایا کی کل آبادی ۶۲ کروڑ سے کم نہیں اور جن کی

عملداری کی حدود طول بلد کے ۵۰ درجوں پر پھیلی ہوئی ہیں اِس وقت اپنے ایک بادشاہ کی اطاعت کی توثیق کے لیے حاضر ہیں۔ہم ان کے وفادارانہ جوش کی جس نے اِن کو ہزاروں کوس سے باوجود بڑے بڑے فاصلوں کے دہلی کھینچ بُلایا ہے بڑی قدر کرتے ہیں۔ اور مجکو تھوڑی دیر میں بہت فخر حاصِل ہوگا جب کہ میں خود ان کی زبان سے شہنشاہ ہند کی تہنیت کے پیغام سنوں گا۔ جو قومی افسر او رسپاہی اسوقت موجود ہیں یہ ہندوستان کی دو لاکھ تیس ہزار فوج سے انتخاب کیے گئے ہیں جنھیں اس بات پر ناز ہے کہ وہ شہنشاہ کی فوج ہیں۔ ویسی امرا عہدہ داریا غیر عہدہ دار جو اس وقت موجود ہیں وہ ۲۳ کروڑ سے زیادہ آبادی کے قائم مقام ہیں اس حساب سے میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دربار میں دنیا کی آبادی کا پانچواں حصّہ کچھ بذات خود اور کچھ بذریعہ وکیلوں اور اپنے حکمرانوں کے جمع ہے سب کے دل میں ایک ہی جوش ہے اور سب کے تسلیم سر پر سلطنت کے سامنے خم ہیں اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر کون سی بات ہے جس نے اس جم غفیر کو کھینچ بلایا ہے۔ تو جواب دیا جائے گا بادشاہ کے ساتھ وفاداری یعنی انکی عطوفت اور انصاف پر اعتماد اور ان کا یہ بھروسہ ایک خیالی بات نہیں بلکہ ان کے ذاتی تجربے کا نتیجہ اور ان کے دلی یقین کا اظہار ہے۔ کیونکہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے اس وسیع آبادی کے اکثر حصّوں کو حملوں اور بد امنی سے

آزادی دے دی ہے سیکڑوں کے حقوق کی وہ حفاظت کرتی ہے اور سیکڑوں کے واسطے معزز روزگار کے فراخ راستے کھول دیے ہیں اور تمام کے واسطے یکساں انصاف کرنے، ظلم سے بچانے اور تہذیب اور امن کی برکتوں کے پھیلانے میں کوشش کرتی ہے اور ایسی سلطنت پر قابض ہونا اول تو آسان کام نہیں، پھر اس کو ایماندارانہ اور منصفانہ طور سے سنبھالنا اور بھی مشکل کام ہے اور سب میں اہم یہ امر ہے کہ سب کو مدبرانہ سیاست سے شیر و شکر کردے یہی مقاصد اور اغراض مدنظر ہیں جس لیے آج یہ دربار کیا گیا ہے، اب میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے روبرو حضور ملک معظم کا وہ شفقت آمیز پیغام پڑھوں جس کی بابت آنحضرت نے آپ کو سنانے کے لیے مجھے ارشاد فرمایا ہے وہو ہذا "

ما بدولت کو اس بات سے نہایت مسرت ہے کہ ہم اپنی ہندوستانی رعایا کو ایسے موقع پر جب کہ وہ ما بدولت کی رسم تاجپوشی ادا کر رہے ہیں پیغام تہنیت بھیجیں۔ لندن کی تاجپوشی کے جلسے میں ہندوستانی رؤسا اور قائم مقاموں کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد شریک ہوئی تھی اس لیے ما بدولت نے وایسرائے اور گورنر جنرل کو اس امر کی ہدایت کی کہ دہلی میں ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا جائے تاکہ تمام دیسی رؤسا امرا حکام گورنمنٹ اور اہل ہند کو اس مبارک رسم کے ادا کرنے کا موقع ملے۔ جس وقت ما بدولت ۱۸۷۵ء میں ہندوستان

تشریف لے گئے تھے، اُس زمانے سے ہند اور اہل ہند کی محبت ہمارے دل میں جاگزیں ہے۔ مابدولت کے خاندان اور تاج و تخت کے ساتھ ان کو جو دلی اور سچی محبت ہے وہ بھی مابدولت پر خوب روشن ہے۔ گذشتہ چند سال کے عرصہ میں اُن کی محبت اور جاں نثاری کی بہت سی شہادتیں مابدولت کے سامنے گذر چکی ہیں اور مختلف معرکوں میں ہماری ہندوستانی افواج نے جو کارہائے نمایاں کیے ہیں ان سے مابدولت بخوبی واقف ہیں۔"

"مابدولت نہایت وثوق سے امید کرتے ہیں کہ تھوڑے عرصہ میں ہمارے فرزند دلبند شہزادۂ ویلز اور اُن کی بیگم صاحبہ پرنسز آف ویلز ہندوستان میں رونق افروز ہوں گے، اور ایسے ملک سے ذاتی واقفیت پیدا کریں گے جس کی بابت مابدولت کی یہ تمنا رہی کہ وہ اس کو جا کر دیکھیں، اور خود ان کو بھی اُس کی سیر کا بڑا اشتیاق ہے۔ اگر مابدولت کا تشریف لانا ہندوستان میں ممکن ہوتا تو نہایت خوشی سے آتے مگر چونکہ یہ بات نہ ہو سکی، اس لیے مابدولت اپنے برادر عزیز ڈیوک آف کناٹ کو، جن کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے روانہ فرماتے ہیں، تاکہ جلسۂ تاجپوشی میں شاہی خاندان کے قائم مقام بن کر شریک ہوں۔"

"جب سے کہ مابدولت اپنی والدۂ مکرمہ معظمہ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ مغفورہ اول قیصر ہند کے تخت پر جانشین ہوئے ہیں، ہماری یہ تمنا رہی ہے کہ ہم انصاف

اور انسانیت کے وہی اصول برتیں جن سے حکومت کر کے ہماری مادرِ مشفق نے اپنی رعایا کے قلوب میں اپنی بزرگی اور عزت پیدا کر لی تھی، ما بدولت اپنے تمام باج گزاروں اور اہلِ ہند کے ساتھ یہ وعدہ بہ تجدید کرتے ہیں کہ اُن کی آزادی کو قائم رکھیں گے، اُن کے مراتب اور حقوق کی پاسداری کریں گے، اور اُن کی بہبودی کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑیں گے۔ یہی اصول اور اغراض ما بدولت کے مدِّ نظر ہیں، اور خداوند عالم کے فضل و کرم سے امید ہے کہ ان سے قلمروِ ہند کو سرسبزی حاصل ہوگی اور ہندوستانی رعایا خوش و خرم رہے گی۔"

"اے شہزادگان والا تبار! اور اے اہلِ ہند! یہ الفاظ اُس ملک معظم کے ہیں جس کی رسمِ تاجپوشی کے ادا کرنے کے لیے آج ہم سب جمع ہوئے ہیں اُن کا ہر حرف ان افسروں کے قلوب میں، جو اُن کے خدمت گذار رہیں، محرک یا الہام کا اثر کرتا ہے اور ہر نکتہ خاص و عام کو بلند حوصلگی اور نیک نیتی کا سبق پڑھاتا ہے۔ یہ الفاظ ان صاحبان کے لیے، جو میرے یا میرے شرکاء کی طرح شہنشاہ معظم کی گورنمنٹ کے بالاصالت آلات ہیں، درستی اخلاق اور توسیع مملکت کے رہنما ہیں ہندوستان کا انتظام نرمی اور فیاضی سے کرنے کا خیال جیسا آجکل عروج پر ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ لوگ جنھوں نے زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں وہ حقیقت میں زیادہ مستحق آفریں ہیں اور جنھوں نے زیادہ عمدہ کار نمایاں کیے ہیں اُن کے حقوق بھی بڑے بڑے ہیں۔ ہندوستان

کے رؤسا نے مملکت کی گذشتہ لڑائیوں میں اپنے سپاہی اور تلواریں ہمارے نذر کیں اور دیگر مصائب میں بھی مثلاً قحط و خشک سالی وغیرہ میں انھوں نے بڑی اولوالعزمی اور بلند ہمتی ظاہر کی اب جو کچھ ان کو حاصل ہے اس سے زیادہ اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو امن و عافیت ان کو حاصل ہے اسمیں کبھی کسی طرح کا خلل نہیں آسکتا تاہم یہ بات ہمارے لیے نہایت باعثِ مسرت ہے کہ سرکار عالیہ ان قرضوں کا جو دیسی ریاستوں کو گذشتہ قحط کے موقع پر دیے گئے ہیں یا سرکار اُن کی کفیل ہوئی ہے۔ تین سال تک کوئی سود نہیں لے گی اور ہم کو اُمید ہے کہ وہ لوگ جن سے ایسا فیاضی کا سلوک کیا گیا ہے اس بات کو بخوشی منظور کریں گے۔ اس عظیم الشان ملک میں اور جو کثیر التعداد جماعتیں اور فریق ہیں اور جن کی ترقی اور بہبودی ہماری دلی تمنا ہے اُن کو بھی بہت جلد کسی ٹیکس کی کمی کا مژدہ سنائیں گے سال حسابی کے وسط میں اعلان کرنا مناسب نہیں کیونکہ ایسے موقع پر تخمینہ کرنا بڑا دشوار کام ہے تاہم اگر موجودہ حالت قائم رہی اور جیسا کہ ہم اُمید کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مالی بہبودی کا زمانہ شروع ہوگیا تو ہم کو اعتماد کامل ہے کہ ملک معظم کے عہد سلطنت کے اوّل ہی زمانے میں سرکار عالیہ رعایاء ہند کے ساتھ کسی ٹیکس کی تخفیف کر کے ہمدردی اور شفقت کے خیالات ظاہر کرے گی اور جس وقت کہ مجھ کو اُن کا مصیبت کا زمانہ اور اُس

موقع پر ان کا صبر اور اُن کی نمک حلالی یاد آتی ہے تو تخفیف ٹیکس کی تدابیر سوچنے میں مجھے نہایت خوشی ہوتی ہے۔ یہاں ان رعایتوں اور مہربانیوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں جن کا دربار سے خاص تعلق ہے وہ کہیں اور درج ہیں تاہم فوجی افسروں سے میں اتنا کہنے کا مجاز ہوں کہ آج سے انڈین سٹاف کور کا نام موقوف ہو گیا اور آپ سب ملکِ معظّم کی ہندوستانی افواج سے متعلق ہیں۔"

"اے امراءِ عالی وقار و متوطنانِ ہند! جب ہم ہندوستان کے مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں تو بلا خطر خزاں اس ملک کی ترقی کا باغ سدا بہار نظر آتا ہے ہندوستان کے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں خواہ وہ آبادی کا ہو یا تعلیم کا خواہ محنت کا ہو یا معاش کا جس کو موجودہ تدابیر نے حل نہ کیا ہو بہت سے مسائل کا حل تو اب ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اگر برطانیہ اور ہند کی متفق افواج سرحد پر مسلسل امن قائم رکھ سکتی ہیں اور اگر ہند کے فرمانرواؤں اور رعایا یورپین اور ہندوستانیوں۔ حاکموں اور محکوموں میں۔ اتحاد رہے اور موسم اپنی فیاضی میں مضائقہ نہ کرے تو آیندہ بھلا ہندوستان کی ترقی کس طرح رک سکتی ہے ہندوستان بفضل کردگار ایک مستقل قحط ناک بدبخت اور نفاق سے بھرا ہوا ہندوستان نہیں ہوگا بلکہ اس کی تجارت کے چشمے جاری ہو جائیں گے اس کے باشندوں کی عقلیں بیدار

ہو جائیں گی۔ اس کی بہبود روز افزوں ہو گی اور آرام اور دولت کی ہر طرف ریل پیل ہو جائے گی میں اپنے ضمیر اور اپنے ملک کے مقاصد پر بھروسہ کرتا ہوں اور ساتھ ہی مجھ کو اس ملک کے بے انتہا ترقی کے سامان دیکھ کر یقین ہے کہ ترقی ضرور ہو گی لیکن یہ یاد رہے کہ یہ مستقبل کبھی بصورت حال نہیں ہو سکتا جب تک کہ کسی بے نظیر حکومت کی عظمت نہ تسلیم کر لی جائے اور یہ بات صرف زیر سایۂ سلطنت برطانیہ ہی ممکن ہے اور اب میں اس تقریر کو اختتام پر لانا چاہتا ہوں میں امید کرتا ہوں اہل ہند کو یہ مجمع عظیم مدت دراز تک یاد رہے گا اس اعتبار سے کہ یہاں اِن کو ایک بڑی تقریب کے موقع پر اپنے شہنشاہ کی ذات اور اُن کے خیالات سے معرفت تامہ حاصل ہوئی میں اُمید کرتا ہوں کہ لوگ جب جب اس تقریب کو یاد کریں گے اُن کو فرحت و مسرت ہو گی اور زمانہ شاہ اڈورڈ ہفتم کا عہد جس کا آغاز ایسا مسعود ہے تواریخ ہند اور سینۂ اہل ہند میں محفوظ رہے گا ہم دعا کرتے ہیں کہ فرماں روائے عالم اور قادر مطلق کی عنایت سے اُن کی شہنشاہی اور قوت سالہائے دراز تک قائم رہے اُن کی رعایا کی بہبودی روز بروز ترقی کرے۔ اُن کے افسروں کے انتظام پر عقل اور نیکی کی مُہر ثبت ہو۔ اور اُن کی سلطنت کا استحفاظ و بہبود برقرار رہے۔"

یہ الفاظ کہکر وایسرائے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے بجائیکہ تمام

مجمع کے نعرہ ہائے خوشی بلند تھے۔ اُنھوں نے ٹھیک آدھ گھنٹہ تک تقریر کی بادشاہ کا پیغام پہونچانے سے قبل اُنھوں نے وہ ٹوپی جواب تک پہنے ہوئے تھے اتار لی تھی۔ اور جب اپنی تقریر کا اتنا حصہ ختم کر چکے تو پھر پہن لی پیغام شاہی جوش نعرہ ہائے خوشی کے ساتھ سُنا یا گیا اور بقیہ تقریر کی خاص خاص ضروری مقامات کی تواضع بھی اکثر نعرہ ہائے خوشی سے ہوئی۔

وایسرائے ابھی اچھی طرح دوبارہ کرسی پر بیٹھنے نہ پائے تھے کہ نقیب اور ترنچی گھوڑوں پر سوار پھر شہ نشین کے قریب گئے اور ایک تان بجائی اس کے بعد وایسرائے کے اشارے سے میجر میکسول نے اپنی ٹوپی بلند کر کے بے انتہا بلند آوازی سے شاہ قیصر ہند کے لیے تین چیرز کی تحریک کی۔ ایک حرکت کے ساتھ سولہ ہزار آدمیوں کی تمام جماعت فی الفور کھڑی ہو گئی اور نعرہ ہائے سرور کا غل دشور تماشا گاہ عظیم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونج اٹھا۔ جب یہاں کی آواز تھم گئی تو باہر کی جانب نعرہ ہائے خوشی پھر بلند کیے گئے اور فوج کے نعروں کا شور جو فاصلہ سے سُنائی دیتا تھا۔ فوج کی لمبی قطاروں سے جو میدان میں قائم تھیں۔ سُنائی دیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندر احاطہ کے زیادہ بلند نعروں کی گونج بھی ہے اور جواب بھی پھر ایک مرتبہ ایمفی تھیٹر کے اندر اور باہر کے باجہ والوں نے

قومی گت بجائی۔ اس کے بعد نقیب اور اُس کے ہمراہی ترمچی اپنی آخری خدمت انجام دے کر رخصت ہوئے۔

(از تاریخ تاجپوشی)

شمس العلما شبلی نعمانی

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

فصاحت۔ علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں، اُن میں تنافر نہ ہو، الفاظ فصاحت نامانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے، اور چونکہ آوازیں بعض، شیریں، دلاویز، اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطے و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شُستہ سُبک، شیریں اور بعض ثقیل بھدّے ناگوار، پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح، بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے یا بہت کم ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، ان کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں، اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کیے جاتے ہیں۔

میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اُردو شعرا میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے

اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے، تاہم اُن کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی، فارسی کے الفاظ جو اردو زبان میں کم مستعمل ہیں، ضرورت سے لانے پڑے ہیں۔ لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں، فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جن سے اُن کی غرابت کم ہو گئی ہے، ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری، خاتم، رخ، بادہ، شنا، حسن، اور اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں، جو بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ٹھیٹ اردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا۔ میر ضمیر ایک موقع پر کہتے ہیں ع ذریت رسول کی خاطر جلائی نار + نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے۔ لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے مثلاً نار دوزخ، نار جہنم، تو وہ غرابت نہیں رہتی۔

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر بعض اس سے بھی فصیح تر، میر انیس صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔

میرزا دبیر، اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار دیکھو، اگر میرزا صاحب

کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو اُن کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر میرزا صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے ہاں فصیح تر ہوں گے۔ میرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے۔

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں، جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

میرزا دبیر	ع	کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
میر انیس	ع	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
میرزا دبیر	ع	آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو
میر انیس	ع	آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
میرزا دبیر	ع	رویا میں بھی حسینؑ کو رویا ہی کرتے ہیں
میر انیس	ع	حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجیے
میرزا دبیر	ع	جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں
میر انیس	ع	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لیے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے، میرزا صاحب جہاں واقعہ نگاری

اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل لفظ آجاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہربانوؑ نے حضرت عباسؑ کی لاش پر نوحہ پڑھا ہے شہربانوؑ کی زبان سے فرماتے ہیں ع ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور۔ اور ایک جگہ فرماتے ہیں ع ناڑہ نوان کی سال گرہ کا نکال لا۔

ابتذال کی صاف اور بیّن مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ میز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں، سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا، ابتذال کا معیار، مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اُن کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی اُن کی شاعری کے دامن پر، ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پایا۔

کلام کی فصاحت یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی، لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے اُن کی ساخت ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازان ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔

میر انیس کا مصرع ہے ع فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں،

میرانیس نے جابجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کہا ہے، لیکن اگر اس مصرعہ میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔

میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ کا مصرعہ پھُس پھُسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں۔ لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جاوے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی، لیکن اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے

اس مصرعہ میں ع

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اِس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس سے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے، اُن آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے ہر سر بجائے خود دلکش اور دلاویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت اور سُر ہیں اس لیے اُن کی لطافت شیرینی اور روانی، اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی لے میں اُن کے مناسب ہوں۔

میر تا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے، ع زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے + اِس میں جتنے الفاظ ہیں یعنے زیر۔ قدم۔ والدہ فردوس۔ بریں۔ سب بجائے خود فصیح ہیں، لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے، جو مصرعہ پیدا ہوا ہے وہ اس قدر بھدّا

اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی، شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے۔ اس لیے ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں شعروں میں۔ اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں، لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں۔

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلد بریں　　میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہے، لیکن یہ بھدا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن اور توافق پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے، اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلاویزی، برجستگی سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں یہی چیز ہے جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

اے کہ خوانی اُستادِ گر بنگری بتحقیق　　صنعت گر است اما شعرِ رواں ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبرؑ کے اذان دینے کی تعریف میں ایک موقع پر اس طرح فرماتے

ہیں ع۔

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ع

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں، لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور اُن کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے، نمونے کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں | قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں | کانٹوں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ولہ

برہم ہوئے یہ سنتے ہی عباسؑ خوش خصال | غازی کو شیر حق کی طرح آگیا جلال
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علیؑ کا لال | اب یاں سے ہم کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت، اُلٹ دیں زمین کو

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور پانی میں تھے نہنگ، اُبھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

چھایا تھا سب پہ رُعب علمدار نوجواں تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں
تیروں کا یکساں تھا ارادہ گریز کا
منھ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

روزمرّہ اور محاورہ جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں، اُن کو روزمرّہ کہتے ہیں، روزمرّہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ اور صاف اور سہل الادا ہوں، اور اگر ان میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجکر صاف ہو جاتے ہیں۔ ابو العلا معرّی جو ایک ملحد شاعر تھا اس نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ گو یہ کلام بلیغ ہے لیکن اس میں کلام مجید کی سی روانی اور صفائی نہیں پائی جاتی، اس ملعون نے کہا ہاں ابھی تو نہیں، لیکن جب دو چار سو برس

نمازوں میں منجکر صاف ہو جائے گا تو روانی آجائے گی۔"

غرض روزمرہ کے لیے فصیح ہونا لازم ہے میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے اور اس پر اُن کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا　　مرجاتے ہیں سن کے روزمرّہ میرا

چونکہ میر انیس کا کوئی کلام اس سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے ہم نمونہ کے طور پر صرف دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں ؎

حشر تک خلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا　　تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا

تعریف کریں ڈر کے تو خورسند نہ ہونا　　اعدا سے کسی بات میں تم بند نہ ہونا

زینب نے کہا جس میں رضائے شہ عالی　　مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک پالنے والی

صدقے کیے فرزند پھوپی سوگ نشیں ہے

سمجھیں تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

زندہ نہ محمد ہے نہ اب عون ہے بیٹا!　　تم بھی جو نہ پوچھو تو مرا کون ہے بیٹا!

ولہ

خادم جدا نہ تھا شہ گردوں سریر سے　　کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

ولہ

کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا　　بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

ولہ

کہتے تھے راہ میں نہ کہ وار اپنا چل گیا　　افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

حسنِ کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ
سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں
مہیب۔ پر رعب۔ سخت، نرم، شیریں، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی
صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں بعض نرم
شیریں اور لطیف ہوتے ہیں، بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے،
بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ،
شیریں سہل اور لطیف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، قصیدہ میں زور،
اور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح رزم،
بزم، مدح و ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند، ہر ایک کے لیے جدا جدا الفاظ
ہیں، شعرا میں سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ
رکھتے ہیں اور یہ اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے، لیکن جو اس
ذوق مراتب سے واقف نہیں یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ اُن پر
اس قدر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے
الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان کا کلام بجز ایک خاص
رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم
اور فردوسی سے بزم نہیں بن سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم، بزم، فخر، ہجو، نوحہ، سب کچھ لکھا ہے
لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے اسی قسم کے الفاظ نکلتے ہیں رزمیہ فخر

لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی رکھ دوں زمیں پہ چھیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو سب دشت گونجتا ہے یہ غصّہ ہے شیر کو
تھا یہ بپھرا ہوا عباس سا شیر جواں سینۂ حر پہ رکھے دیتا تھا نیزہ کی سناں
لرزہ چڑھا تھا رعب سے ہر نابکار کو روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

دیکھو! ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں، جس طرح، اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح، الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

حصۂ نظم

مثنویات

از خواجہ الطاف حسین حالی

حبِّ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو! / اے فضائے زمیں کے گلزارو!

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا! / اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ہوا!

اے عنادل کے نغمۂ سحری! / اے شبِ ماہتاب تاروں بھری!

اے نسیمِ بہار کے جھونکو! / دہرِ ناپائدار کے دھوکو!

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز / تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا / تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے / تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی / تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اِک اِک تمھاری بھاتی تھی / جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری / دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال — شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوے وہ دن اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غُربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دُنیا — پر نہیں ہم کو لطف دُنیا کا
اے وطن! اے مرے بہشت بریں! — کیا ہوے تیرے آسمان و زمیں؟
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مِٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ سب تجھ پہ ہیں فدا اے یار!

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن! تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز۔ اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

اے دل! اے بندۂ وطن! ہشیار!
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او نشاطِ خودی کے متوالے!
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حبِّ وطن!
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
تو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبت ہے
یہی الفت میں کوئی الفت ہے

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں یہی و انار
ہو نہیں سکتے بار ور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اس کو جلنے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں — جان کے اُن کی لالے پڑتے ہیں
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری — اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہتے حُبّ وطن اسی کو اگر — ہم سے حیوان نہیں ہیں کچھ کمتر
بیٹھے بے فکر کیا ہو۔ ہموطنو! — اُٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو۔ تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ۔ پیو۔ چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ — دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک — کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ۔ تو جی میں تم شرماؤ — ٹھنڈا پانی پیو۔ تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا — اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو — واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ۔ تو پہلے لو خبر اُن کی — جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو۔ تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ — کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر — ہے کوئی اُن میں خشک کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند — کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مُقبلو! مدبروں کو یاد کرو — خوشدلو! غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والے ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

(حالی)

برکھا رُت

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی

قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لیے کتاب عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

منہ کا ہے زمین پہ ڈر پڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسل صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور ہے چار طرف برس رہا نور
ٹیلا ہے نہ ہے سڑک نمودار اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے "پیہو پیہو" اور مور جھنگارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک ہیں جو بولنے پہ آتے سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
سب خوان کرم سے حق کے ہیں سیر پانی میں مگر۔ کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست قلاش ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسمان پر (حالی) نکلے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

از مثنوی سحر البیان مصنّفہ میر حسن دہلوی

میر غلام حسن نام حسن تخلص۔ شرفائے دہلی سے تھے۔ فن شعر میں میر درد اور مرزا سودا سے مشورہ کرتے تھے۔ ایام شباب میں دلی سے فیض آباد آئے۔ پھر لکھنؤ۔ وہیں یہ مثنوی لکھی جس سے بہتر اردو میں کوئی مثنوی نہیں ہوئی۔ بیان سادہ پر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور۔ جس معاملہ کو بیان کیا ہے اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔

کروں پہلے توحید یزداں رقم جھکا جس کے سجدہ کو اوّل قلم
سر لوح پر رکھ بیاض جبیں کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا

نہیں کوئی تیرا۔ نہ ہوگا شریک ‏ تری ذات ہے وحدہ لاشریک
پرستش کے قابل ہے تو اے کریم! ‏ کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم
رہ حمد میں تیری عزّ و جل ‏ تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل
وہ الحق۔ کہ ایسا ہی معبود ہے ‏ قلم جو لکھے۔ اُس سے افزود ہے
تر و تازہ ہے اس سے گلزار خلق ‏ وہ ابر کرم ہے ہوادار خلق
اگرچہ وہ بے فکر غیور ہے ‏ ولے پرورش سب کی منظور ہے
کسی سے بر آوے نہ کچھ کام جاں ‏ جو وہ مہرباں ہو۔ تو کل مہرباں
نہاں سب میں اور سب میں ہے آشکار ‏ یہ سب اس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار
اُسی سے ہے کعبہ اُسی سے کنشت ‏ اسی کا ہے دوزخ۔ اُسی کی بہشت
وہ ہے مالک الملک و دنیا و دیں ‏ ہیں قبضہ میں اس کے زمان و زمیں
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے ‏ وہ کچھ شے نہیں۔ پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں ‏ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں
تامل سے کیجے اگر غور کچھ ‏ تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ
دیا عقل و ادراک اس نے ہمیں ‏ کیا خاک سے پاک اس نے ہمیں

وصفِ سخن

پلا مجھ کو ساقی شراب سخن ‏ کہ ہو جس سے مفتوح باب سخن
سخن کی مجھے فکر دن رات ہے ‏ سخن ہی تو ہے۔ اور کیا بات ہے
سخن کے طلبگار ہیں عقلمند ‏ سخن سے ہے نام نکویاں بلند
سخن کی کریں قدر مردان کار ‏ سخن نام ان کا رکھے برقرار

سخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام
جنھیں چاہیے ساتھ نیکی کے نام

سخن سے سلف کی بھلائی رہی
زبان قلم سے بڑائی رہی

کہاں رستم و گیو و افراسیاب
سخن سے رہی یاد یہ نقل خواب

سخن کا صلہ یار دیتے رہے
جواہر سدا مول لیتے رہے

سخن کا سدا گرم بازار ہے
سخن سنج اس کا خریدار ہے

رہے جب تلک داستان سخن
الٰہی رہیں قدردان سخن

سواری کی تیاری

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام
کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

سواری تکلف سے تیار ہو
مہیا کریں جو کہ درکار ہو

کریں شہر کو گل کے آئینہ بند
سواری کا ہو لطف جس سے دوچند

رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر

یہ فرما محل میں گئے بادشاہ
نقیبوں نے سن حکم لی اپنی راہ

خوشی میں گئی جلد جو شب گزر
ہوئی سامنے سے نمایاں سحر

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید
عجب روز تھا مثل روز امید

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ "بابا! نہا دھو کے تیار ہو"

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں
عرق آگیا اس کے اندام میں

تن نازنیں نم ہوا اس کا کل
کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل

نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادہ کو نہلا دھلا / دیا خلعتِ خسروانہ پنہا
نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار / کیے خوان گوہر کے اس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم / ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار / ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار
وہ ماہی مراتب۔ وہ تخت رواں / وہ نوبت۔ کہ دولھا کا جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما / سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی / قدم با قدم۔ با لباسِ زری
سوار اور پیادے۔ صغیر و کبیر / جلو میں تمامی امیر و وزیر
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار / چلے سب قرینے سے باندھے قطار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام / لباسِ زری میں ملبس تمام
غرض اس طرح سے سواری چلی / کہے تو۔ کہ بادِ بہاری چلی
رعیت کی کثرت۔ ہجوم سپاہ / گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ
لگا لنج سے تا ضعیف و نحیف / تماشے کو نکلے وضیع و شریف
نظر جس کو آیا وہ ماہ تمام / کیا اس نے جھک جھک کے اُس کو سلام
غرض شہر سے باہر اک سمت کو / کوئی باغ تھا شہ کا اس میں سے ہو
سواری کو پہنچا گئی فوج ادھر / گئے اپنی منزل پہ شمس و قمر
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ / رہا ساتھ سب کے طربناک وہ
قضا را وہ شب تھی شب چاردہ / پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
نظارہ سے تھا اُس کے دل کو سرور / عجب عالمِ نور کا تھا ظہور

عجب لطف تھا سیر مہتاب کا
کہے تو کہ دریا تھا سیماب کا

کچھ آئی جو اس مہ کے جی میں ترنگ
کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
کہ بھایا ہے عالم لب بام کا

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا

جہاں تک کہ چوکی کے تھے پاسدار
ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

شہزادہ گم ہو گیا

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں
تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو
نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اُس کی بُو

نہ بن آئی کچھ اُن کو اِس کے سوا
کہ کہیے یہ احوال اب شہ سے جا

ہوا گم وہ یوسف پڑی یہ جو دھوم
کیا خادمان محل نے ہجوم

شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی
رہی تھی جو باقی سو روتے کٹی

عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ

سحر نے کیا جیب گریباں چاک
اُڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک

اٹھا شہر میں سب طرف شور و غل
کہ غائب ہوا اس چمن سے وہ گل

غم و درد سے دل جو سب کا بھرا
ہوا باغ سارا وہ ماتم سرا

وہ لبریز جو نہر تھی جابجا
سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا

ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ
کیا رخت پانی سے اپنا سیاہ

کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار
کوئی دل میں روئے کوئی ڈھار ڈھار

جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ
لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

منقش جہاں تھے وہ رنگیں مکاں　ہوئے سب وہ جوں دیدۂ خوں چکاں
گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل　سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل
نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا　فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا
وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ　کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
"کہا گو جدائی گوارا نہیں　ولیکن خدائی سے چارا نہیں"
"خدا کی خدائی تو معمور ہے　غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے
یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پر　بہر نوع رہنے لگے یک دگر
لٹایا بہت باپ نے مال و زر　ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر

شادی کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز　چڑھا بیاہنے وہ مہ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار　بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا　کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے　سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور اُنکے بعد　گرجنا وہ دھوسوں کا مانند رعد
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے　تلنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے
براتی ادھر اور ادھر جوق جوق　وہ آواز سرنا - وہ آواز بوق
وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ　کہیں تو کہ تنکے کی اوجھل پہاڑ
دو رستہ برابر برابر وہ تخت　کسی پر کنول - اور کسی پر درخت
اناروں کا دغنا چھچھپنے کا زور　ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات!
بلوریں دھرے شمعداں بے شمار چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت کہ بس ملے ایک سے ایک سب پیش و پس
وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان پلا سب کو شربت دیے پاندان
وہ سب ہو چکے جب کہ رسم و رسوم سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا۔ وہ ٹونے کا وقت وہ دلہن کی رخصت۔ وہ رونے کا وقت
وہ دلہن کا رو رو کے ہونا جدا وہ ماں باپ کا اور رونا جدا
نکلتے وہ جانا محل سے جہیز کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز
یہاں موت ہے اہل عرفان کو کہ جانا ہے اک دن یونہیں جان کو
وہ جو درد مندی سے ہیں آشنا وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

شہزادہ کا ملنا

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل کہ "غائب ہوا تھا سو آیا وہ گل"
خبر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو "کیا گم انھوں نے وہیں آپ کو"
لگے رونے آپس میں زار و نزار کہا "ہائے! ہم کو نہیں اعتبار"
کہا سب نے "صاحب! چلو تو سہی کہ بیٹا تمھارا وہی ہے! وہی!
مگر سنا جب کہ بیٹے کا ناؤں چلا پھر تو روتا ہوا ننگے پاؤں

جو ہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں — چلا سر کے بل بے نظیر جہاں
گرا پانوں پر کہہ کے یہ باپ کے — خدا نے دکھائے قدم آپ کے
سنی یہ صدا جو ہیں اس ماہ کی — تو اُس غم رسیدہ نے اک آہ کی
ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے — کہ یوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے
ہوئے شاد و خرم صغیر و کبیر — چلے لے کے نذریں امیر و وزیر
مے عیش سے سب کو مستی ہوئی — نئے سر سے آباد بستی ہوئی
در آمد ہوا گھر میں سرو رواں — لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں
کہ اتنے میں آگے نظر جو پڑی — تو دیکھا کہ ہے راہ میں ماں کھڑی
بہی چشم سے آنسوؤں کی قطار — گرا ماں کے پانوں پہ بے اختیار
وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے — یہ روئی کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا — وہ دونوں کی دو ہاتھ سے لی بلا
ہوئی جان اور جی اُن پر نثار — پیا پانی اُن دونوں پر وار وار
وہ آنکھیں جو اندھی تھیں روشن ہوئیں — زمینیں جو تھیں خشک گلشن ہوئیں
زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ — دوبارہ انھوں نے کیا اس کا بیاہ
بنا اُن کی تقدیر کا جو بناؤ — نکالے انھوں نے یہ سب دل کے چاؤ
ہوا شہر پر فضل پروردگار — وہی شاہزادہ۔ وہی شہر یار
وہی بلبلیں اور وہی بوستاں — شگفتہ گل و مجمع دوستاں

(حسن دہلوی)

از مثنوی گلزار نسیم

پنڈت دیا شنکر متخلص نسیم سرکار اودھ کی فوج میں منشی تھے۔ اور فن سخن میں خواجہ آتش کے شاگرد۔ قصہ گل بکاؤلی جو پہلے نثر میں تھا۔ اس کو نظم کر کے گلزار نسیم نام رکھا تشبیہ استعارہ اور صنائع لفظی و معنوی سے بیان کو آراستہ اور قصہ کو مختصر کیا ہے۔ میر حسن کی مثنوی کے بعد یہ ہی مثنوی ہے جو مقبول عام ہوئی۔

۱

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنے کہ مطیع پنجتن ہے

ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زبان کی پیش دستی

۲

روداد زبان باستانی
یوں نقل ہے خامہ کی زبانی

پورب میں ایک تھا شہنشاہ
سلطان زین الملوک ذیجاہ

لشکر کش و تاجدار تھا وہ
دشمن کش و شہریار تھا وہ

خالق نے دیے تھے چار فرزند
دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند

نقشہ ایک اور نے جما یا
پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

تھا افسر خسرواں وہ گلفام
پالا تاج الملوک رکھ نام

پردے سے نہ دایہ نے نکالا
پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

جب نام خدا جواں ہوا وہ
مانند نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ | نظارہ کیا پسر کو ناگاہ
مہر لب شہ ہوئی خموشی | کی نور بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی | چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ باوشہ نے ٹالا | اس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور | خارج ہوا نور دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور | لایا کوئی جا کے سرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور | بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے | مختار ہے جس طرح نباہے

۳

تھا اک کحال پیر دیریں | عیسیٰ کی تھیں اس نے آنکھیں دیکھیں
وہ مرد خدا بہت کراہا | سلطاں سے ملا کہا کہ شاہا!
ہے باغ بکاؤلی میں اک گل | پلکوں سے اسی پہ مار چنگل
خورشید میں یہ ضیا کرن کی | ہے مہر گیا اسی چمن کی
اُس نے تو گل ارم بتایا | لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا
شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار | رخصت کیے شہ نے چار و ناچار
شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ | لشکر۔ اسباب۔ خیمے۔ خرگاہ

۴

وہ بادیہ گرد خانہ برباد | یعنی تاج الملوک ناشاد
میداں میں خاک اڑا رہا تھا | دیکھا۔ تو وہ لشکر آ رہا تھا

پوچھا "تم لوگ کے خیل — جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل"؟

بولا لشکر کا ایک سپاہی — جاتی ہے ارم کو فوج شاہی"

سلطان زین الملوک شہ وَر — دیدار پسر سے ہو گیا کور

منظور علاج روشنی ہے — مطلوب گل بکاؤلی ہے

گل کی جو خبر سنائی اس کو — گلشن کی ہوا سمائی اس کو

ہمرہ کسی لشکری کے ہو کر — قسمت پہ چلا وہ نیک اختر

یک چند پھرا کیا وہ انبوہ — صحرا صحرا و کوہ در کوہ

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے — گل کا نہ پتا لگا کسی سے

۵

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار — یعنی تاج الملوک دل زار

درویش تھا بندۂ خدا وہ — اللہ کے نام پر چلا وہ

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا — عنقا تھا نام جانور کا

مرغان ہوا تھے ہوش راہی — نقش کف پا تھے ریگ ماہی

وہ دشت کہ جس میں پر تگ و دو — یا ریگ رواں تھا یا وہ رہرو

ڈانڈا تھا ارم کے بادشاہ کا — اک دیو تھا پاسباں بلا کا

بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک — فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک

حلوے کی پکا کر اک کڑھائی — شیرینی دیو کو چڑھائی

کہنے لگا۔ کیا مزا ہے دلخواہ! — اے آدمی زاد واہ وا واہ!

چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو / کیا اس کے عوض میں دوں میں تجھ کو؟

بولا وہ۔ کہ پہلے قول دیجے / پھر جو میں کہوں قبول کیجے

گلزار ارم کی ہے مجھے دھن / بولا وہ ارے بشر! وہ گلبن

خورشید کے ہم نظر نہیں ہے / اندیشہ کا واں گذر نہیں ہے

رہ جا! مرا بھائی ایک ہے اور / شاید کچھ اس سے بن پڑے طور

حال اس سے کہا کہ قول ہارا / ہے پیر یہ نوجوان ہمارا

مشتاق ارم کی سیر کا ہے / کوشش کرو۔ کام خیر کا ہے

حمالہ نام دیونی ایک / چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک

خط اس کو لکھا باین عبارت / "اے خواہر مہرباں سلامت

پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد / رکھیو اسے جس طرح مری یاد

"انسان ہے چاہے کچھ جو سازش / مہمان ہے کیجیو نوازش"

"باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول / مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول"

"دل داغ اس کا برائے گل ہے / نرگس کے لیے ہوائے گل ہے

خط لے کے بشر کو لے اڑا دیو / پہونچا حمالہ پاس بے ریو

بھائی کا جو خط بہن نے پایا / بھیجے ہوئے کو گلے لگایا

دیوؤں سے کہا کہ چوہے بنجاؤ / تا باغ ارم سرنگ پہونچاؤ

سن حاجت نقب مہر گلگشت / کترا چوہوں نے دامن دشت

جب مہر تہ زمیں سمایا / اس نقب کی رہ وہ آدم آیا

کھٹکا جو نگاہبانوں کا تھا / دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا

گوشہ میں کوئی لگا نہ ہووے! ‏ خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے!
گو باغ کے پاسبان غضب تھے ‏ خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے
پانی کے جو بلبلوں میں بیٹھا گل ‏ پہونچا لب حوض سے نہ چنگل
پوشاک اُتار اُتر کے لایا ‏ پھولا نہ وہ جامہ میں سمایا
گل لے کے بڑھا ایاغ بر کف ‏ چوری سے چلا چراغ بر کف
گل ہاتھ میں مثل دست بیضا ‏ اس نقب کی آستیں سے نکلا
گل لے کے جب آ ملا وہ گلچیں ‏ اس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

۶

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا ‏ اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام ‏ یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے ‏ اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی ‏ پرآب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو۔ وہ گُل ہوا ہُوا ہے ‏ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل ‏ جھنجھلائی۔ کہ کون دے گیا جُل؟
ہے ہے! مرا پھول لے گیا کون؟ ‏ ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے ‏ بُو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟ ‏ بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چرانے والا ‏ اوپر کا تھا کون آنے والا؟
جس کف میں وہ گل ہو۔ داغ ہو جائے! ‏ جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے؟

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
گلچیں کا جو ہاے! ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار! پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل؟
او باد صبا۔ ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا؟
بلبل! تو چہک اگر خبر ہے؟ — گل! تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے؟
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سے رپٹ مو بر اندام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
گل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزہ کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاؤلی کو!
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اٹھی۔ ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس تختہ میں مثل باد جاتی — اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

(نسیم لکھنوی)

از مثنوی میر تقی

محمد تقی نام میرؔ تخلص شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ دلی پہونچ کر اُن کی شاعری نے شہرت پائی شعرائے ماضی و حال نے ان کو غزل گوئی کا امام مانا ہے۔ مثنویاں بھی اچھی ہیں۔ مگر قصیدہ پھیکا۔ کلام اُنکا نہایت صاف و شستہ اور پُر اثر ہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ سو برس کے ہو کر ۱۲۲۵ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ دردؔ۔ سوداؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاؔ۔ اور جرأتؔ۔ کے ہمعصر تھے۔

ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل رے خامہ بسم اللہ اب
کر ٹک۔ دل کا راز نہانی — ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستہ غم تھا — سر تا پا اندوہ و الم تھا
تاب و تواں و شکیب و تحمل — رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوننابہ گویا
دل میں تمنا۔ داغ جگر میں — شیون لب پر۔ یاس نظر میں
نالے شب کو اُس کے سُن کر — مر گئے کتنے۔ سر کو دھن کر
روے و جبیں پہ خراش ناخن — داغوں سے خوں کے قامت گلبن
غم نے تو دل میں کیا ہی چھوڑا — بر میں تھا اک پکا پھوڑا
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکین بے آرامی ہی سے
دشنۂ غم سے سینہ کوچا — ناخن سے منہ سارا نوچا

دل آما جگہ غم ناکی
نے طاقت نے یارا اس کو
رنگ اڑے چہرہ کا ہر دم
رنگ شکستہ بسکہ فسردہ
دیدۂ تر کے دریا قائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خاک بسر آشفتہ سری سے
وادی پر جب اپنے آوے
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عریاں
پامالی ہیں مثل جادہ
اس کے جو پامال ہوئے سب
جس نے دیکھا اس کو یکدم

[illegible] اک تیر خاکی
ضعف [illegible] لی نے مارا اُس کو
تھا گویا کُل آخر جو سم
کہنے کو زندہ۔ لیکن مردہ
ساحل خشک لبی کے سائل
خونباری سے سیل بہاری
شورِ قیامت نوحہ گری سے
صحرا صحرا خاک اڑاوے
جی پہ عرصہ تنگ ہمیشہ
بید سا کانپے ہوئے پریشان
نقش قدم سا خاک افتادہ
خار بیاباں لال ہوئے سب
اس نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
پر مدت تک یہ یاد رہے گا

(میر)

غزلیات

جہاں اُستاد۔ فصیح الملک۔ نواب مرزا خاں۔ داغ دہلوی

۱

جہاں تیرے جلوہ سے معمور نکلا — پڑی آنکھ جس کو وہ پرطور نکلا
یہ سمجھے تھے ہم ایک جرکا ہے دل پر — دبا کر جو دیکھا تو ناسور نکلا
نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا — مگر ایک نکلا تو منصور نکلا
وجود و عدم دونوں گھر پاس نکلے — نہ یہ دور نکلا نہ وہ دور نکلا
سمجھتے تھے ہم داغ گمنام ہوگا — مگر وہ تو عالم میں مشہور نکلا

۲

وہ زمانہ نظر نہیں آتا — کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا
دل نے اس بزم میں بٹھا تو دیا — اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا
رہیے مشتاق جلوۂ دیدار — ہم نے مانا نظر نہیں آتا
لے چلو مجکو رہروان عدم — یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا
دل پُر آرزو لٹا اے داغ — وہ خزانا نظر نہیں آتا

۳

دل میں ہے غم و رنج و الم حرص و ہوا بند — دنیا میں تجھس کا ہمارے نہ کھلا بند
موقوف نہیں دام و قفس پر ہی اسیری — ہر غم میں گرفتار ہوں۔ ہر فکر میں پابند

اے حضرتِ دل! جائیے۔ میرا بھی خدا ہے
بے آپ کے رہنے کا نہیں کام مرا بند
دم رکتے ہی سینہ سے نکل پڑتے ہیں آنسو
بارش کی علامت ہے۔ جو ہوتی ہے ہوا بند
کہتے تھے ہم اے داغ! وہ کوچہ ہے خطرناک
چھپ چھپ کے مگر آپ کا جانا نہ ہوا بند

۴

حضرتِ دل! آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں
گر فرشتہ وش ہوا کوئی۔ تو کیا؟
آدمیت چاہیے انسان میں
جس نے دل کھویا۔ اسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا۔ اسی نقصان میں
کس نے ملنے کا کیا وعدہ کہ داغ
آج ہو تم اور ہی سامان میں

۵

خدا دے۔ تو دے اپنا غم ہر کسی کو
کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو
نہ کرنا چھیا! ایسی دیوانی باتیں
یہ کیا؟ کھینچ مارا جو پتھر کسی کو
محبت میں جس جا گئے لٹ گئے ہم
لیا دل کسی نے۔ دیا سر کسی کو
بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتائیے گا
ستاتے نہیں بندہ پرور کسی کو

۶

نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد۔ دولت زیادہ!
وہ تشریف لاتے ہی بولے کہ رخصت!
نہیں ہم کو ملنے کی فرصت زیادہ!
الٰہی! زمانہ کو کیا ہو گیا ہے؟
محبت تو کم ہے عداوت زیادہ!
عدم سے سب آتے ہیں یاں چار دن کو
نہیں ہوتی منظور رخصت زیادہ!
مری بندگی سے مرے جرم افزوں
ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ!

۷

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چمپا کھلی۔ گلاب کھلا۔ موتیا کھلی

ہم تو اسیرِ دام ہیں صیاد! ہم کو کیا؟
گلشن میں گر بہار بہت خوش نما کھلی

نالوں سے شق ہوا نہ جگر پاسبان کا
دیوارِ قید خانہ مگر بارہا کھلی

رونا نصیب میں ہو تو ہنستا ہو کس طرح؟
تو شکلِ گل نہ بلبلِ خوں میں نوا کھلی

داغ شگفتہ دل کا ذرا دیکھنا اثر
مانندِ غنچہ قبر بھی بعدِ فنا کھلی

۸

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا
جن سے خلش تھی دل میں۔ وہ کانٹے نکل گئے

سچ ہے پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہِ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

اب کیا ہے اگر کسی سے ملاتے نہیں نظر
لاکھوں ہماری آنکھ سے چلبلے نکل گئے

مرنے کے ساتھ کوئی بھی مرتا نہیں کبھی
فرقت میں رفتہ رفتہ سب احباب ٹل گئے

احباب ڈھونڈھتے ہیں۔ پریشان ہیں رفیق
کیا جانے! آج داغ کدھر کو نکل گئے

۹

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر۔ تو کیا غم ہے!

کہتے ہو۔ کچھ کہو۔ کہوں کیا خاک!
جانتا ہوں۔ مزاج برہم ہے

اک جہاں مہرباں ہوا۔ تو کیا!
مہربانی تری مقدم ہے

سنتے ہیں داغ! کل وہ آئے تھے
بارے اب تو سلوک باہم ہے

۱۰

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں
یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی

نہ تھی یہ خبر ہم کو۔ اپنی بہار
اِدھر آئے گی اور اُدھر جائے گی

نہ چھوڑے گی دامن کبھی مشتِ خاک
صبا ہم سے اُڑ کر کدھر جائے گی

دیا دل تو اے داغؔ اندیشہ کیا؟
گذرنی جو ہوگی گذر جائے گی

امیر الشعراء منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی

(۱)

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
برنگِ بو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے
جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہوا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو۔ دُرِ یگانہ ہوا

چُنے مہینوں ہی تنکے غریب بُلبُل نے
مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا

اُٹھائے صدمے پہ صدمے۔ تو آبرو پائی
امیرؔ ٹوٹ کے دل گوہرِ یگانہ ہوا

(۲)

وہ تو سنتا ہی نہیں میں دادخواہی کیا کروں!
کس کے آگے جا کے سر پھوڑ دوں۔ الٰہی کیا کروں

مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس!
چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں

مجھ کو ساحل تک خدا پہونچائے گا اے ناخدا!
اپنی کشتی کی بیاں تجھ سے تباہی کیا کروں

وہ مرے اعمال روز و شب سے واقف ہے امیرؔ
پیشِ خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں؟

۳

انساں عزیز خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو
پیری میں بھی گیا نہ تغافل ہزار حیف
آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہ دیدارِ ہو نصیب
جانے اگر۔ کہ چاہِ عدم میں گرائے گا

وہ مہرباں نہ ہو۔ تو کوئی مہرباں نہ ہو
اتنا بھی کوئی مائلِ خوابِ گراں نہ ہو
حاصل جبیں سے کیا؟ جو ترا آستاں نہ ہو
کوئی سوارِ توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

(۴)

دل نے جب پوچھا مجھے کیا چاہیے؟
حرصِ دنیا کا بہت قصّہ ہے طول
ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم
ہے مزاج اس کا بہت نازک امیرؔ

درد بول اُٹھا۔ تڑپنا چاہیے
آدمی کو صبر تھوڑا چاہیے
کچھ مزہ اس کا بھی چکھا چاہیے
ضبطِ اظہارِ تمنّا چاہیے

(۵)

کی دل شکنی نہ تند خو کی
کی جس پہ نگاہ۔ مجھ کو دیکھا
جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں
دل ہی نہ رہا امید کیسی
کلفت نہ مٹی امیرؔ دل سے

سختی پہ بھی نرم گفتگو کی
اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی
راہیں تو یہی ہیں جستجو کی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی
اشکوں نے ہزار شست و شو کی

(۶)

موتی کی طرح جو ہو خدا داد
جاتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں

تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے
مجھ کو اے درد! تو بہت ہے

مانند کلیم بڑھ نہ اے دل! — یہ دید کی گفتگو بہت ہے
لے نشترِ غم! ہو لاکھ تن خشک — تیرے دم کو لہو بہت ہے
کیا غم ہے امیر! اگر نہیں مال — اس وقت میں آبرو بہت ہے

از مؤلف

۱

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا — تیرا اچھا ہوا برا نہ ہوا
سب جتایا کیے نیازِ قدیم — وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیا کھلے؟ جو کبھی نہ تھا پنہاں — کیوں ملے؟ جو کبھی جدا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اٹھتا — کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
تو نہ ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا — اور کوئی ہوا۔ ہوا نہ ہوا

۲

جو بھلے برے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا — نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا
میں کبھی کا مر بھی رہتا نہ غمِ فراق سہتا — اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا — کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

۳

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں — ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
دوستی اور کسی غرض کے لیے! — وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

جام وحدت کی درد بھی جس نے	نہیں چکھی۔ وہ متقی ہی نہیں
جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام	غم سے بدتر ہے۔ وہ خوشی ہی نہیں

۴

جہاں تیغ ہمت علم دیکھتے ہیں	محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں
کمالات صانع پہ جن کی نظر ہے	وہ خوبی مصنوع کم دیکھتے ہیں
نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں	انھیں دمبدم تازہ دم دیکھتے ہیں
اڑاتے ہیں جو جوشِ ہمت کو سرپٹ	وہ منزل کو زیر قدم دیکھتے ہیں

۵

ہے وصف ترا محیطِ اعظم	یاں تاب کسے شناوری کی
دی زندگی اور اس کا سامان	کیا شان ہے بندہ پروری کی
کیا آنکھ کو دل دیا کہ جس میں	وسعت ہے چرخ چنبری کی
کی بعد خزاں بہار پیدا	سوکھی ٹہنی ہری بھری کی
کیا بات ہے ! اگر کیا ترحم	ہیہات ! جو تو نے داوری کی
ہر شکل میں تھا وہی نمودار	ہم نے بھی نگاہ سرسری کی

۶

راہ و رسم خط کتابت ہی سہی	گل نہیں۔ تو گل کی نکہت ہی سہی
بیدماغی بندہ پرور۔ اس قدر	آپ کی سب پر حکومت ہی سہی
بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے	یاد ایام فراغت ہی سہی
حسن صورت کا نہ تھا اصلاً فریب	کلک صنعت گر کی صنعت ہی سہی

کچھ نہ کرنا بھی مگر ایک کام ہے / گر نہیں صحبت۔ تو عزلت ہی نہیں

۷

ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے / لیکن کبھی تبدیل جبلت نہیں ہوتی
ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہ طلب میں / پست اس سے اولو العزم کی ہمت نہیں ہوتی
خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اُسے منہ پہ / جو بات کہ شایستۂ جلوت نہیں ہوتی
ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت / اصلاح پذیر اس لیے عادت نہیں ہوتی
پتے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو / اس شخص کی دنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی
ڈھاتی ہے قیامت یہی خونخوار جہاں میں / کچھ غم نہیں ہوتا جو محبت نہیں ہوتی

۸

وہ جان بیچ کر بھی جو فضل و ہنر ملے / جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے
جب چشم آز پھوٹ گئی سب خلش مٹی / اب سنگریزہ ہاتھ لگے یا گہر ملے
ممکن نہیں بغیر قناعت فراغ بال / ہر چند تودہ تودہ تجھے سیم و زر ملے
جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز / قسمت سے ان گنوں کے ہمیں چارہ گر ملے

۹

غیر توکل نہیں چارا مجھے / اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے
حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا / صبر و قناعت نے ابھارا مجھے
جو وہ کرے اُس کو سزاوار ہے / چون و چرا کا نہیں یارا مجھے
فرصت اوقات ہے بس مغتنم / یہ نہیں ملنے کی دوبارا مجھے
آہ! نہیں جرأت افشائے راز / قصہ تو معلوم ہے سارا مجھے

سراج الدین محمد۔ بہادر شاہ۔ ظفر

سراج الدین محمد نام تھا۔ بہادر شاہ لقب۔ ظفر تخلص آخری جانشین شاہانِ مغلیہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ اِن کا کلام نہایت سادہ و سلیس اور روزمرہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے۔

(۱)

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا — کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
نہ بھیجا تو نے لکھ کر ایک پرچہ — ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
نہ بولا۔ ہم نے کھڑکایا بہت در — ذرا دربان کو کھڑکایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا۔ تو نے تقدیر! — وہاں تک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا
دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے — ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

(۲)

ہر بات میں تو ایک بھی ہے لاکھ پہ بھاری — گر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا
ہے جامۂ تکلف کا پسندیدہ احمق — ہوگا نہ گدھا یہ کبھی اس جھول سے ہلکا
جز تارکِ دنیا ہو ہوس سے نہ سبکدوش — یہ بوجھ نہ دنیا کے ہو مشغول سے ہلکا
صرفہ نہیں کاغذ کا مگر بھیجتے ہیں وہ — خط ڈاک میں اندیشۂ محصول سے ہلکا
دنیا میں ظفر جو ہے گرانبار جہالت — کب ہوتا ہے وہ مردمِ معقول سے ہلکا

(۳)

آگے پروانہ ہی گیا اس بزم میں جل بھن گیا! — شمع بھی یاں رو گئی شعلہ بھی یاں سر دُھن گیا
جائیے اس دید پہ اور دھونی رما کر بیٹھیے — جو گیا دل سوختہ واں باندھ کر یہ دھن گیا
نام جس کا رہ گیا کچھ اس کا گُن باقی رہا — ورنہ جو یاں سے گیا۔ ساتھ اس کے اُس کا گُن گیا

میں صبا! وہ طائر بے طاقت اس گلشن میں ہوں
ایک پر جس کا نہ اڑ کر تا سر گلبن گیا

واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشوونما
سبز ہو سکتا نہیں وہ۔ جو کہ دانہ گھن گیا

جاگ اٹھا خوابِ عدم سے یک بیک سارا جہاں
کان میں جس دم ظفر! خالق کا امر کن گیا

۴

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ !
اس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ !

کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تو انگر
از مہر نشاں۔ لیک نشاں بعد فنا ہیچ !

ایماں کو نہ دے ہاتھ سے غافل! کہ بس گ
آنے کا نہیں کام ترے اس کے سوا ہیچ !

۵

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا مثال نقش پا!
جو کہ مٹ جانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر

دل سے ہو کیونکر طریق آشنائی میں خلاف
آشنا وہ ہے۔ کہ جو ہو آشنا کی راہ پر

ہے صراط المستقیم اسکے لیے جس نے ظفر
استقامت کی ہے تسلیم و رضا کی راہ پر

۶

اتنا نہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

کم ظرف! پُر غرور! ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانند جوش خم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوز دل کے ساتھ
اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل

یہ غول وش ہیں۔ ان کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل

ق

انسان کو کل کا پتلا بنایا ہے اُسنے آپ
اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں۔ کہ دیکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجکو! نہ چل۔ چل سنبھل کے چل

جو امتحان طبع کرے اپنا اے ظفر
تو کہدو اس کو طور پہ تو اس غزل کے چل

۷

نہیں تم کو لازم بُرائی کی باتیں
بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں

غضب ہو اگر دل میں تو رکھو کدورت
کرو منھ پہ ہم سے صفائی کی باتیں

اگر سیدھے ہوتے مرے بخت واژوں
تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں

ظفر! کیا زمانہ بُرا آگیا ہے
جہاں دیکھو ہیں واں برائی کی باتیں

(۸)

گرد جو اے شہسوار! آئی نظر اڑتی ہوئی
تیرے آنے کی ہمیں پہونچی خبر اڑتی ہوئی

دل جلوں کی ہوتی قسمت میں بربادی تو کیوں
پھرتی پروانہ کی خاکستر اڑتی ہوئی

وہ شکار انداز لے جب ہاتھ میں اپنے تفنگ
برق تھرا جائے کبک دیکھکر اڑتی ہوئی

بے ثباتی کیا کہوں ہستی کی دیکھی ہی نہیں
سُرخی رنگ حنا جلد اس قدر اڑتی ہوئی

ہو جو کچھ رونق صفائی میں ہے دل کی ورنہ یاں
خاک ہی دیکھی کدورت میں ظفر اڑتی ہوئی

۹

کیا کیا آکر تری محفل میں ہم نے شمع ساں!
ہاں! مگر جلکر بروں کی جان کو ہم رو گئے

حضرت دل تو گئے پر کر گئے اور اک ستم
ساتھ اپنے مجکو بھی دونوں جہاں سے کھو گئے

شوق اپنا تم سے دونا ہی محبت میں رہا
جب وہاں سے ایک خط آیا یہاں سے دو گئے

اے ظفر! جاؤ دل دیوانہ کو ڈھونڈھو کہیں
ہے خدا جانے کہاں؟ مدت ہوئی اس کو گئے

ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق

کلام نہایت عام پسند۔ محاورات و ضرب الامثال خوب باندھتے ہیں۔ مفصل حال دیکھو صفحہ ۶۲ حصۂ نثر۔

(۱)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیونکر؟ — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے — نکل جاتے۔ مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا! — دہن پایا۔ لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض۔ خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اُس کا کہاں عالم میں اے ذوق — کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

(۲)

نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا — اے فلک! گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

کون گھر آئنہ کے جاتا؟ اگر وہ گھر میں — خاکساری سے نہ جاروب صفائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہر گز یہ خدا کے بندے — گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ اگر دیکھنا ہے **ذوق**! کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

(۳)

بے نصیب اس کے ہیں گردِ دیار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

اُٹھ چکا وہ ناتواں۔ جو رہ گیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق! میرے وادیِ پرخار سے

ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

(۴)

وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہے شاخِ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

قربانِ ستم کش ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں بہے جاتے ہیں ہم سوئے دیار
مقصود رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اے ذوق! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

(۵)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

ہے یہ جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو! ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے! کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

کبھی افسوس ہے آتا۔ کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

نازِ گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق — اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۶)

نہیں ثبات بلندی عز و شاں کے لیے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو، اور سیف ہے جواں کے لیے
جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا — تو مول لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لیے
اگر امید نہ ہمسایہ ہو۔ تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لیے
وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن — لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے
بنایا آدمی کو ذوق! ایک جزو ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے

(۷)

ایسا نہو کہ آتے ہی جواب خط — قاصد! جواب زندگی مستعار دے
اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آب بقا تو کیا! — مانگو۔ تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے
پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصد خوں کو آئے۔ تو پہلے پکار دے
اس جبر پر تو ذوق! یہ انساں کا حال ہے — کیا جانے کیا کرے! جو خدا اختیار دے

(۸)

لائی حیات۔ آئے۔ قضا لے چلی۔ چلے — اپنی خوشی نہ آئے۔ نہ اپنی خوشی چلے
ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہوگا بدقمار — جو چال ہم چلے۔ وہ نہایت بری چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے — پر کیا کریں! جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمر خضر بھی۔ تو ہو معلوم وقت مرگ — ہم کیا رہے یہاں! ابھی آئے ابھی چلے

حکیم مومن خان۔ مومن

مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ وطن دِلّی۔ طبابت پیشہ آبائی ۱۲۱۵ھ؁ ہجری میں پیدا ہوئے ۱۲۶۸ھ؁ میں رحلت کی۔ نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے۔ اُن کی روش خاص معاملہ بندی ہے۔ کہیں میر و درد کی سی سادہ بیانی۔ کہیں باریکی۔ ذوق و غالب کے ہمعصر تھے۔

(۱)

وعدۂ وصلت سے ہو دل شاد کیا! — تم سے دشمن کی "مبارکباد" کیا!
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا!
ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا!
نالہ اک دم میں اڑا ڈالے دھوئیں — چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا!
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو — بے وفا! پھر حاصل بیداد کیا!
کیا کروں اللہ! سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا! نالہ کیا! فریاد کیا!
اِن نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!
بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس — لب پہ مومن ہرچہ بادا باد کیا!

(۲)

کیا رم نہ کروگے۔ اگر ابرام نہ ہوگا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
ہاں جوش تپش! چھیڑ چلی جائے کہ پر تو — بکھر جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
ناکامی امید پہ صبر آئے تو کیا آئے — ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے۔ اگر الہام نہ ہوگا

(۳)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

آہ! طول امل ہے روز افزوں
گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مومن مضطر
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۴)

قابو میں نہیں ہے دل کم حوصلہ اپنا
اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلا اپنا

لبیک حرم ہم ہیں۔ نہ ناقوس کلیسا
پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا

تھکے دشت میں ہمراہ مرے آبلہ چند
سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

اس حال کو پہونچے ترے قصہ سے کہ اب ہم
راضی ہیں۔ گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر ہم
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

(۵)

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

ستم۔ آزار۔ ظلم۔ جور۔ جفا
جو کیا۔ سو بھلا کیا صاحب

کیوں الجھتے ہو جنبش لب سے
خیر ہے! میں نے کیا کہا صاحب

کیوں لگے دینے خط آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

نام عشق بتاں نہ لو مومنؔ!
کیجیے بس خدا خدا صاحب

(٦)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں! کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مجھ سے نہ بولو تم۔ اسے کیا کہتے ہیں بھلا!
انصاف کیجیے۔ پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا!
لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گُل کھلے گا! دیکھیے ہے فصل گل تو دُور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(٧)

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

اف ری گرمی محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

میں دکھاتا تمھیں تاثیر۔ مگر ہاتھ مرے
ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دعا کے اُٹھے

شعر مومنؔ کے پڑھے بیٹھ کے اُس کے آگے
خوب احوال دل زار سنا کے اُٹھے

(٨)

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے۔ تو کیا کی

فلک کے ہاتھ سے میں جا چھپوں۔ گر
خبر لا دے کوئی تحت الثریٰ کی

جفا سے تھک گئے۔ تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

کہا اس شوخ سے "مرتا ہے مومنؔ"
کہا "میں کیا کروں مرضی خدا کی"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مصطفیٰ خاں نام شیفتہ تخلص۔ جہانگیرآباد ضلع بلندشہر کے جاگیردار اور عمائد دہلی سے تھے۔ ان کی ذات ستودہ صفات امارت۔ فقر اور علم و فضل کی جامع تھی۔ ریختہ میں حکیم مومن خاں مومن سے مشورہ کرتے تھے۔ کلام نہایت متین و سنجیدہ۔ فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ ۱۲۸۶ھ ہجری میں رحلت فرمائی۔

(۱)

اے جانِ بیقرار ذرا صبر چاہیے — بے شک اِدھر بھی آئیگا جھونکا نسیم کا
جس کی سرشت صاف نہ ہو آدمی نہیں — نیرنگ و عشوہ کام ہے دیوِ رجیم کا
طاعت اگر نہیں۔ تو نہ ہو یاس کس لیے — وابستہ سبب ہے کرم کب کریم کا
جس وقت تیرے لطف کے دریا کو جوش آئے — فوارہ جناں ہو زبانہ جحیم کا
اے شیفتہ! عذابِ جہنم سے کیا مجھے! — میں امتی ہوں نار و جناں کے قسیم کا

(۲)

دِلِ زار کا ماجرا کیا کہوں! — فسانہ ہے مشہور سیماب کا
کہاں پھر وہ نایاب! پایا جسے — غلط شوق ہے جنس نایاب کا
نہ کیجو غل۔ اے خوشنوایانِ صبح! — یہی وقت اُن کے شکرخواب کا
محبت نہ ہرگز جتائی گئی — رہا فکر کل اور ہر باب کا
وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے — جہاں شغل ہو سیرِ مہتاب کا
میں پیہم رہتا ہوں خائف۔ کروں — جفا میں نہیں دخل اسباب کا
نہ کرنا خطا پر نظر شیفتہ — کہ اغماض شیوہ ہے احباب کا

(۳)

اہلِ طریق کی بھی روش سب سے ہو الگ — جتنا زیادہ شغل۔ زیادہ فراغ بال

ہنگامِ عہد کام میں لائے وہ ایسے لفظ — جن کو ہے معنی متعدد پر اشتمال

یہ بات تو غلط ہے۔ کہ دیوانِ شیفتہ — ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال

لیکن مبالغہ تو ہے البتہ! اس میں کم — ہاں! ذکرِ خدّ و خال۔ اگر ہو تو خال خال

(۴)

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ — آئینہ میں ہو آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیے۔ صورت سے کیا حصول — کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے — جوں آفتاب و روشنی آفتاب میں

قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو — دیکھو وہ آنکھ سے۔ جو نہ دیکھا ہو خواب میں

مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتا لگے — کھویا ہے ہم نے آپ کو عہدِ شباب میں

وہ قطرہ ہوں۔ کہ موجۂ دریا میں گم ہوا — وہ سایہ ہوں۔ کہ محو ہوا آفتاب میں

اس صوتِ جاں نواز کا ثانی نہیں بنا — کیا ڈھونڈھتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے آفتِ زمانہ! ترے دو پیش شکیب — بلبل کو باغ میں ہے۔ نہ ماہی کو آب میں

بیباک شیوہ۔ شوخ طبیعت۔ زباں دراز — ملزم ہوا ہے۔ پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر۔ حضور! — اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

(۵)

جو کہ ہوا محوِ تجلّی ذات — خاکِ در اُس شخص کی اکسیر ہے

کھیل ہے کچھ یہ؟ کہ دکھا دوں تمھیں — فرض کیا۔ آہ میں تاثیر ہے
خط کے نہ لکھنے کا لکھوں کیا گلہ؟ — خامہ! مدد کر۔ دمِ تحریر ہے
کیا کہوں! احباب کی آہن دلی — پانوں میں فولاد کی زنجیر ہے
ہم سے وہ ناحق جو خفا ہو گئے — شیفتہ! کچھ اپنی ہی تقصیر ہے

(۶)

ستمگر کہے سے بُرا مانتا کیوں! — ستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے
جو بیگانہ جانے تجھے خلق کیا غم! — اگر آشنا۔ آشنا جانتا ہے
اُسے کنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت! — جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے
بہر صورت آئینہ بھی مغتنم ہے — کچھ آئینِ اہلِ صفا جانتا ہے
ہمیں شیفتہ کی نصیحت سے حاصل! — کہ وہ آپ ہم سے سوا جانتا ہے

(۷)

ابھی کہوں۔ تو کریں لوگ شرمسار مجھے — کہ کس کے وعدہ پر اتنا ہے انتظار مجھے
یہی گمان یہی رشک ہے اگر۔ تو کبھی — نہ کوئی دوست ملے گا نہ کوئی یار مجھے
قفس میں کرتی ہے تحریک بال جنبانی — نوائے دلکشِ مرغانِ شاخسار مجھے
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو۔ آئے کرے شکار مجھے
رہے سرائرِ مکتومہ دل ہی میں افسوس — جہان میں نہ ملا کوئی رازدار مجھے
جفا کو ترک کرو تم۔ وفا کو میں چھوڑوں — کچھ اشتہار تمھیں ہو۔ کچھ اشتہار مجھے
جو شورشیں نہ مچاتا۔ اسیر کیوں ہوتا! — خراب تو نے کیا۔ جلوۂ بہار مجھے
بڑے فساد اٹھیں شیفتہ! خدا نہ کرے — کہ اُن کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ان کے کلام میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بکثیر۔ مگر الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی بے مثل معانی کثیر الفاظ قلیل میں بیان کرنا ان کا خاصہ ہے۔ ابتدائے عمر میں دس برس تک بیدل و اسیر کے طرز پر خیالی مضامین لکھا کیے۔ جب تمیز آئی اس دیوان کو چاک کر ڈالا دیوان حال میں کچھ نمونہ ابتدائی کلام کا موجود ہے۔

(۱)

دوست غمخواری میں کبھی میری سعی فرمائینگے کیا! — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا؟

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور! کب تلک — ہم کہینگے عرض حال اور آپ فرمائینگے کیا؟

حضرت ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرش راہ — کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو۔ کہ سمجھائینگے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟

خانہ زاد زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں! — ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد — ہم نے یہ مانا۔ کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا؟

(۲)

یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے۔ یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے۔ اگر اعتبار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے۔ کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو۔ کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو۔ وہ اگر شرار ہوتا

کہوں کس سے میں۔ کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا۔ اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا۔ کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی۔ تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف! یہ ترا بیان! غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ؟ — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا ؟

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا ؟

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا! — بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی! — آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب! — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۴

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم — سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

(۵)

کب سے ہوں (کیا بتاؤں) جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں۔ جو وہ لکھیں گے جواب میں

ہے آج کیوں ذلیل۔ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر۔ کہاں (دیکھیے) تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے۔ نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(۶)

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے! وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو۔ جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں۔ غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے۔ برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد!
گر نہیں وصل۔ تو حسرت ہی سہی

(۷)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں!
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط مُنھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

خواجہ حیدر علی۔ آتش

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص۔ اِن کے والد دِلّی سے لکھنؤ آئے۔ خواجہ کو ابتدائے عمر سے شاعری کا چسکا لگا۔ شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ غزل گوئی میں شیخ ناسخ سے مقابلہ رہا۔ ان کے کلام میں لطف محاورات اور گرمی و تاثیر بہ نسبت شیخ ناسخ کے زیادہ ہے۔

(۱)

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے۔ کہ جو دیوانہ ہے اس کا

وہ شوخ نہاں گنج کی مانند ہے اس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی۔ آئینہ ہے اس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے۔ وہ شوخ اس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اس کا

وہ یاد ہو اس کی جو بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر۔ وہ یارانہ ہے اس کا

یوسف نہیں۔ جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہو بیعانہ ہے اس کا

آوارگی نکہتِ گل ہے یہ اشارہ
جامہ سے وہ باہر ہو۔ جو دیوانہ ہے اس کا

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے۔ بیگانہ ہے اس کا

شکرانۂ ساقیٔ اجل کرتا ہے آتش
لبریز ہے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

(۲)

ہر رنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

ہزاروں حسرتیں جائینگی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان۔ جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا سامان درست آتش!
سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا

(۳)

نہ بوریا بھی میسر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیے چھپر کھٹ کا

مطیعِ نفس نہ اللہ نے کیا مجھکو
نہ میں نے پیروی غول کی۔ نہ میں بھٹکا

نہ بھول بیٹھ کے بالائے سرو اے قمری!
چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

عجیب بھول بھلیاں ہے غفلتِ ہستی
جسے کہ راہ ہوئی اس سے خوب ہی بھٹکا

عجب نہیں ہے۔ جو سودا ہو شعر گوئی سے
خراب کرتا ہے آتش! زبان کا چٹکا

(۴)

اے چرخ بے مروت! بس بے تنک مزاجی!
خوش تیرے گھر میں دو دن اک میہماں نہ ٹھہرا

برباد کر نہ ناحق اے بادِ صرصر اس کو
بلبل کا آشیانہ برگِ خزاں نہ ٹھہرا

عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ
کنجِ لحد سے بہتر کوئی مکاں نہ ٹھہرا

پھونکا آشیاں ہمارا اے برقِ آتشِ گل!
رہنے کے قابل اپنے یہ بوستاں نہ ٹھہرا

میری ہی خاک پر کی منھ زوری اُس نے آتش
پھروں سمندِ قاتل ورنہ کہاں نہ ٹھہرا

(۵)

مسافر کی طرح رہ خانہ بردوش
نہیں جائے اقامت دار فانی

یقیں ہے دیدۂ باریک بیں کو
کرے عینک طلب یہ ناتوانی

یہ مشت خاک ہو مقبول درگاہ
صبا کی چاہتا ہوں مہربانی

سفیدی مو کی ہو کافور ہر چند
کہیں مٹتا ہے یہ داغ جوانی

نہ خوش ہو فربہی تن سے۔ غافل!
سبک کرتی ہے مردہ کو گرانی

موے جو پیشتر مرنے سے۔ وہ لوگ
کفن سمجھے قبائے زندگانی

ہوا کوئی نہ حال دل سے آگاہ
رہی مشتاق گوش اپنی کہانی

خدا کے حکم سے ہے قوت نطق
کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی

مرا دیواں ہے اے آتش! خزانہ
ہر اک بیت اس میں ہے گنج معانی

(۶)

آنکھوں کو کھول۔ اگر تو دیدار کا ہے بھوکا
چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی

کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے!
پی جائیے گا کس کو! شربت نہیں ہے کوئی

ہم نے کہا کبھی تو تشریف لاؤ۔ بولے
معذور رکھیے۔ وقت فرصت نہیں ہے کوئی

دل لیجیے جان سے بھی سائل جو ہو تو حاضر
حاضر جو کچھ ہو۔ اس میں حجت نہیں ہے کوئی

ہم شاعروں کا حلقہ۔ حلقہ ہے عارفوں کا
ناآشنائے معنی صورت نہیں ہے کوئی

ہر وہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا
تجکو نہ چاہے۔ ایسی خلقت نہیں ہے کوئی

نازاں نہ حسن پہ ہو مہماں ہے کوئی دم کا
بے اعتبار ایسی دولت نہیں ہے کوئی

یوں بد کہا کرو تم۔ یوں مال کچھ نہ سمجھو
ہمسایہ بھی خیر خواہ دولت نہیں ہے کوئی

ناوشنا-کہ ومہ کرتا ہے ذکر تیرا
اس داستاں سے خالی صحبت نہیں ہے کوئی

(۷)

منزل ہی دور ہی جو یہ پہونچی نہیں ہنوز
دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی

دکھلائے سیر آنکھوں کو بام مراد کی
ایسی کوئی کمند-کوئی نردباں نہ تھی

نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدے سے ابا
ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی

افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجیے!
وہ کون سی بہار تھی جس کو خزاں نہ تھی

نالوں سے ایک دن نہ کیے گرمِ گوش یار
آتش اگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ لکھنؤ کے مشاہیر شعرا سے ہیں اور اپنے وقت کے استاد۔ میر تقی مصحفی۔ انشا۔ جرات کا اخیر زمانہ دیکھا تھا۔ خواجہ آتش کے ہمعصر تھے کلام ان کا اصول فن کے مطابق نہایت جنچا تلا۔ تشبیہ و تمثیل سے معمور۔ مگر دلاویزی و تاثیر کم۔

(۱)

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینہ میں کینہ ہو۔ وہ سینہ نہیں اچھا

آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے
مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا

ہو سیر جو منظور (دلا) بحرِ جہاں کی
جز کشتیِ درویش سفینہ نہیں اچھا

(۲)

دشمن سر ہو تری گردن کشی مانند شمع
افسرِ زر شوق سے رکھ پر نہ اتنا سر اٹھا

زندگی ہیں صرف کرتا ہو سبکدوشی حصول
مثل قاروں خاک میں جا کر نہ بارِ زر اٹھا

چاہیے تعمیرِ دل جو ساتھ اٹھا لیجائے گا
یوں خرابی کے لیے دیوار اٹھا یا در اٹھا

ن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی	پوچھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا!
ن ہنسی سے جعل احب سخنداں ہی نہیں	زانوے فکرت سے اے ناسخ! تو اپنا سر اٹھا

(۳)

ہیر خاک ہیرے گوہر جسموں کی قدر	لعل قیمت کو پہونچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر
ہر غربت میں ثروت پڑ پڑی اپنا کے بعد	رنج اُٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر
صلا نہیں۔ گر ہے جہاں زیرنگیں	اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر
پوشاک پر مرتا ہے تو۔ کل دیکھیو!	جائیگا نباش تیری لاش عریاں چھوڑ کر

(۴)

قدروں کی خاک سے اٹھتی ہے ہر دم سر قد	گرد باد اے اہل غفلت! اس بیاباں میں نہیں
اشی کی چھت لگا نہیں مانع کوئی	کل بجز خفاش کوئی سقف ایواں میں نہیں
شمیں بنتے سب ہیں لفتی مثل نسیم	گل تو کیا! کانٹا بھی اکدن اس گلستاں میں نہیں
بلتے تھے جن کے سامنے شیر ژیاں	غیر روباہ و شغال اب اُن کے ایواں میں نہیں
ن ہو کر زمانہ میں ہوے نالاں بشر	آشنا نالوں سے ہرگز نے نیستاں میں نہیں

(۵)

زا ایک وضع پر رنگ جہاں نہیں	وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں
تجھے بہار سے تعقوب ہوا اگر	یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں
کے شکر میں کبھی ہائیں کبھی کبھی	تنہا برائے لذت دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں

(۶)

بیاں کیا ہو سکے عمرِ رواں کی مجھ سے چالاکی
کہ اس توسن سے لگا ہو نہ ترکی کو نہ تازی کو

اکیلا دل مرا فوجِ تمنا کے مقابل ہے
الٰہی کیجیو تو فتحیاب اس مردِ غازی کو

ثمر پختہ جو ہو (اے خام طبعو!) باغِ عالم میں
نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

(۷)

پاشکستہ جو ہو کرتا ہو جہاں میں سلطنت
یہ صدا آتی ہو ہر دم تربتِ تیمور سے

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہو کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں
بارِ غم دنیا میں اٹھواتے نہیں مزدور سے

دیکھنا (اے اہلِ عبرت!) انتقامِ آسماں
بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

شیخ قلندر بخش جرأت

قلندر بخش نام۔ جرأت تخلص۔ اکبر آبادی مشہور ہیں۔ مگر ان کے والد دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں پہونچ کر ان کی غزلوں نے شہرت پائی۔ عین جوانی میں نابینا ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ میر انشا اور مصحفی کے ہمعصر تھے۔ ان کے کلام میں میر کی سی سادہ بیانی اور لطفِ محاورہ تو ہے مگر مضامین رندی و ہوا پرستی کی حد سے باہر کم نکلتے ہیں۔

(۱)

غم رو رو کے کہتا ہوں کچھ اس سے اگر اپنا
تو ہنس کے وہ بولے ہے میاں! فکر کر اپنا

باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری!
غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

عالم میں ہو گھر گھر خوشی و عیش پر اس بن
ماتم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا

ہر بات کا بہتر ہے چھپانا ہی کہ یہ بھی
ہو عیب کرے کوئی جو ظاہر ہنر اپنا

کیا کیا اُسے دیکھ آتی ہے جرأت! ہمیں حسرت
مایوس جو پھر آتا ہے پیغامبر اپنا

(۲)

بلبل سے نہ کیونکر قفس میں چمن کی بات!
آوارۂ وطن کو لگے خوش وطن کی بات

عیش و طرب کا ذکر کروں کیا میں۔ دوستو!
مجھ غمزدہ سے پوچھیے رنج و محن کی بات

شاید اُسی کا ذکر ہو۔ ہر رہگزر میں میں
سنتا ہوں گوشِ دل سے ہر اک مرد و زن کی بات

جرأت! خزاں کے آنے سے چمن میں رہا نہ کچھ
اٹک گئی زباں پہ گل و یاسمن کی بات

(۳)

صوتِ بلبلِ دلِ نالاں نے سنائی مجھکو
سیرِ گل دیدۂ گریاں نے دکھائی مجھکو

لاؤں خاطر میں نہ میں سلطنتِ ہفت اقلیم
اُس گلی کی جو میسر ہو گدائی مجھکو

صلح میں جس کی نہیں چین یہ اندیشہ ہے
آہ! دکھلائیگی کیا اُس کی لڑائی مجھکو

وصل میں جس کے نہ تھا چین سو جرأت افسوس
وہ گیا پاس سے اور موت نہ آئی مجھکو

(۴)

اتنا بتلا مجھے ہرجائی ہوں میں۔ یار! کہ تو
میں ہر اک شخص سے رکھتا ہوں سروکار کہ تو

کم ثباتی مری ہر دم ہے مخاطب بہ حباب
دیکھیں تو پہلے ہم اس بحر سے ہوں پار کہ تو

ناتوانی مری گلشن میں یہ ہی سمجھے ہے
دیکھیں اے نکہتِ گل! ہم ہیں سبکبار کہ تو

دوستی کر کے جو دشمن ہوا تو جرأت کا
بیوفا وہ ہے۔ پھر اے شوخ ستمگار کہ تو

(۵)

دی خبر پیکِ صبا نے کیا یہ گلشن میں جو آہ
غنچۂ پژمردہ ساں دل کی کلی مرجھا گئی

ضعفِ پیری روز اُس کا انتقام اب لے ہے آہ
قبل ازیں عمرِ جوانی جو مزے دکھلا گئی

اُس سے کیوں بچتے ہو کیا سودا چڑھا تجکو دلا! وہ نہیں گر آپ میں۔ تو تو ہی بس کر جا گئی
اے اجل! بس یہ تو رسوائی نہ دیکھی جائیگی طبع غمخواروں کی اپنے اب بہت اکتا گئی
اب ڈھٹائی سمجھیے یا اِس کو جرأت جانیے آئینگے جی۔ آئینگے! اب تو طبیعت آ گئی

(۶)

مشکل ہے جو آوے وہ احاطے میں خرد کے گو اُس کا تصور کوئی ادراک سے باندھے
دعویٰ نہ کرے برق کبھی اپنی تڑپ کا گر پانوں ترے توسن چالاک سے باندھے
قاتل ہو وہ سنگھ۔ تو ابھی ڈر کے یہ بھاگیں جو تیغ و سپر پھرتے ہیں بے باک سے باندھے

سید انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ نام۔ انشا تخلص۔ شرفاے دہلی سے تھے۔ استعداد علمی میں لائق و فائق۔ فارسی۔ عربی ترکی سے ماہر۔ شیخ مصحفی نے ان کو فیضی زماں لکھا ہے۔ کلام میں ہزل و ظرافت زیادہ ہے مگر جو صاف اور سنجیدہ ہے وہ بے مثل و نظیر۔ میر و مصحفی و جرأت کے ہمعصر تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے ۱۲۳۳ھ میں بحالت دیوانگی انتقال کیا۔

(۱)

جس شخص نے کہ اپنی نخوت کے بل کو توڑا راہ خدا میں اس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دل شگفتہ تالاب کا کنول تھا افسوس تو نے ظالم! ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعت فرنگی۔ دل چپ جو ہو رہا ہے کیا جانیے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا
وا اعجم نے تجھ سے کیا کیا شکست کھائی اے چرخ! تو نے کس کس اہل دول کو توڑا
یعنی ہے جلس دل تو ظالم تو آج لے چپک پڑ جائے گا وگرنہ پھر اس کا کل کو توڑا
احوال خوش انھوں کا انشا میاں جنھوں نے اس ذات بحت سے مل بند اجل کو توڑا

(۲)

ہوتا نکلا قسمت اثر تیرا — اب کس کو ہے اعتبار تیرا
اللہ! کہ کام آ رہے گا — مجھ سا یک رنگ یار تیرا
جیسے جہاں تلک تو چاہے — میرا کیا! اختیار تیرا
نشا سے نہ روٹھ، مست خفا ہو — ہے بندۂ جاں نثار تیرا

(۳)

لتے ہیں یوں اپنے تن کے اندر — دَوں لگ رہی ہو جیسے گرمی میں بن کے اندر
سو کہہ کے چپ چاپ ہیں ہم ایسے — گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر
زیادہ نازک جو دلبران رعنا — ہیں کلی میں شبنم کے پیرہن کے اندر
ق
نہ تعجب سو دیکھے پاؤں پھیلا — یہ رنگ گورے گورے کیونکر کفن کے اندر
رہے بٹھایا اے ماہ مصر خوبی! — یعقوب وار ہم کو بیت الحزن کے اندر
الکے ہے سنتے ہو میر انشا! — ہیں طرفہ ہم مسافر اپنے وطن کے اندر

(۴)

ہوا میں یہ کیفیت اب کے ہے — سو رنگ کے شگفتہ ہیں گل شاخسار پر
سو کے دانہ شبنم اگر کروں — جاتی ہے چٹ نگاہ پھسل سبزہ زار پر
ہتے ہیں اپنے صحن باغ میں — تاک اینڈتے ہیں مست پڑے جوئبار پر
لالہ خود رونے اے نسیم! — کچھ آگ سی لگائی ہے آ کوہسار پر

(۵)

دل کٹھر کٹھر دل کے ہر اک خراش سے — چھیڑ دو اس کو دوستو! تیز قلم تراش سے

ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا برابری! — ہم ہیں کمینہ اک غلام فرقۂ خواجہ تاش سے
موسمِ گل ہے دوستو! جائیے وہ سیرِ باغ کو — اٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہِ فراش سے
حضرتِ عشق! دیر میں رہتے ہو یا حرم میں تم — مجکو نہیں کچھ اطلاع آپ کی بود و باش سے
ہے یہ دو روزہ زندگی ہم کو وبالِ گردن آہ! — لے وہ خوشا! جو چھوٹ گئے دغدغۂ معاش سے

(۶)

یہ جائے ترحم ہے۔ اگر سمجھے تو صیاد — میں اور پھنسوں اس طرح اس کنجِ قفس میں
آتی ہے نظر اس کی تجلی ہمیں زاہد! — ہر چیز میں ہر سنگ میں ہر خار میں خس میں
کیا پوچھتے ہو؟ عمر کٹی کس طرح اپنی — جز درد نہ دیکھا کبھی اس تیس برس میں
ہر بات میں یہ جلدی ہے ہر چیز میں اصرار! — دنیا سے نرالی ہیں غرض تیری تو رسمیں
انشا ترے گر گوشِ صنم ہوں نہ تو آوے — آواز تجھے یار کی ہر بانگِ جرس میں

(۷)

بن گئی بندۂ درگاہ سے اور آپ سے خیر! — ہم الفت میں اگر ایسے ہی آئین ہوئے
راہ رو! چونک۔ کہ ہے قافلہ میں تیاری — محمل اونٹوں پہ بندھے فوج میں سب زین ہوئے
قمری و بلبل نالاں میں پڑے جو جھگڑے — سو دلِ غمزدہ کے موجبِ تسکین ہوئے
شاہ آنکھوں سے قدم رکھ نہیں سکتے باہر — دولتِ شرم سے مانند سلاطین ہوئے
قصدِ بنگالہ مناسب ہی نہیں صاحب کو — گرچہ معلوم تجارت کے سبب آئین ہوئے
جی ہی اچھا نہ رہا پھر۔ تو عیاذاً باللہ! — فائدہ کیا! جو شناسائے اراکین ہوئے

(۸)

کر بیٹھے وہیں فضل خدا داد پہ تکیہ — جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دو سے

جانِ اہل توکل نفسِ اشخاص کو۔ جو ہیں — محفوظ پیاز و نمک دگردۂ جو سے
اے دل! وہ خوشا کشت برومند کہ جسکو — خطرہ ہی نہیں تہلکۂ وقت درو سے
افواجِ گل و لالہ میں ہے زلزلہ انشا — اس بادِ بہاری کی سواری کی جلو سے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص۔ وطن اصلی امروہہ۔ دلی میں آکر علوم رسمیہ حاصل کیے۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ پہونچے۔ اور ریختہ گوئی میں میر و سودا کے بعد علم استادی بلند کیا۔ خود فرماتے ہیں
شعر اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں + دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا + ان کا کلام نہایت صاف و شستہ ہے کہیں بطرز سودا کہیں بطرز میر۔

(۱)

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا — یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا
کیا لطف مقام ان کو! جو مشتاق عدم ہیں — دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا
کیا بھیجیے قاصد کو وہاں! کوچہ میں جس کے — جبریلؑ کو مقدور نہیں نامہ بری کا
تربت پہ مری برگ گل تازہ چڑھا لے — احسان ہے مجھ پر نسیم سحری کا
بندہ ہے ترا مصحفی خستہ کو یا رب — محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

بوئے محبت اپنی رکھی خدا نے اس میں — سینہ میں آدمی کے دل عطرداں بنایا
اپنی تو اس چمن میں عمر اس طرح سے گذری — یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا
گرم سفر رہے ہم منزل کو پر نہ پہونچے — آوارگی نے ہم کو ریگ رواں بنایا
اے مصحفی! گریباں سارا لہو سے تر ہے — یہ رنگ اپنا ظالم! تو نے کہاں بنایا

(۳)

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا
اپنے رہنے کو مکاں چاہیے تنہائی کا

شیشۂ دل کو مرے چور کیا کیوں اس نے؟
کیا بگاڑا تھا بھلا گنبد مینائی کا

بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

مصحفی! ریختہ پہونچا مرا کس رتبہ کو
شور یاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

(۴)

کیا غیر کا کھٹکا ہے؟ کہ میں کچھ نہیں کہتا
منھ مجھ سے پھیرا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

دیوانے جو ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کیا کیا
مجکو بھی سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

جو چاہتے ہیں مجکو وہ کہتے ہیں۔ خدا یا!
تو عالم و دانا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے مصحفی! بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل
بعضوں کا مقولہ ہے کہ میں کیا کچھ نہیں کہتا

(۵)

بوئے خوں دیتا ہے کچھ مجکو یہ گلشن اے صبا
ہم شہیدوں کا یہاں کس کس کے مدفن اے صبا

کس کے ماتم میں ہوئے ہیں گل ہزاروں سینہ چاک
بلبلیں کرتی ہیں کس کشتہ پہ شیون اے صبا

ہم اسیران قفس کو تب خبر دی تو نے آہ!
لٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا

ڈال کر شبنم کے منھ پر سے یہ گلشن کان میں
اب سکھے ہولی میں بناتا گل کو جوگن اے صبا

(۶)

معشوق ہوں یا عاشق معشوق نما ہوں
معلوم نہیں مجکو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہد تنزیہ کے رخسارہ کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں

ہستی کو مری ہستی عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست۔ مگر ہستی عالم سے جدا ہوں

اندازہیں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں
سوز جگر و دل ہوں۔ کبھی ناز و ادا ہوں

ہے مجھ سے گریبان گل و صبح معطر
میں عطر نسیم چمن و باد صبا ہوں

گوش شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں ساز حقیقت کی صدا ہوں

یہ کیا ہے۔ کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی! اشیا میں ہیں مری جلوہ گری ہیں
ہر رنگ میں ہیں مظہر انوار خدا ہوں

(۷)

چہرہ اتر رہا ہے۔ نقشے بگڑ گئے ہیں
کچھ ان دنوں تو تیرے کچھن سے جھڑ گئے ہیں

تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر
کشتوں کے ہر گلی میں ستھراؤ پڑ گئے ہیں

روتا پھروں نہ کیونکر میں قافلہ میں ہر سو
منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۸)

فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش کرنا
شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں

یہ درمیاں جو مہینوں بگاڑ رہتا ہے
وہی شریر نہیں کچھ شریر ہم بھی ہیں

حسد کی جا نہیں اے مصحفی! کلام ان کا
کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

(۹)

تو بہار آئی ہے سودا سے کہن تازہ ہوا
سبزہ کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

ہوں وہ غارت زدہ رہرو کہ نمودار ہے صاف
میری صورت سے حقیقت مری ویرانی کی

محو ہر دم جو رہے اپنی ہی آرائش کا
اس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

مصحفی! دوں میں جہاں ریختہ گوئی کا لوچ
قدر شیرازی کی ہو واں۔ نہ صفاہانی کی

میر محمد تقی میر

حالات کے لیے دیکھو صفحہ ۲۰ حصۂ نظم

(۱)

ابتداے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

قافلہ میں صبح کے اک شور ہے
یعنے غافل ہم چلے سوتا ہے کیا؟

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟

یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟

غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

(۲)

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال بھی کبھو گذرا نہ پر فشانی کا

نمود کرکے وہاں بحر غم میں ڈوب گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

(۳)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا
پیش آئے اگر مرحلہ جدائی کا

یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے
دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا

کبھو پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں
خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا

رکھا ہے باز ہمیں دربدر کے پھرنے سے
سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا

جناں میں میر ہی کے ساتھ جاتا تھا لیکن
کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا

متروک کبھی مستعمل ، متروک کبھو مستعمل ، متروک کبھو مستعمل ،

(۴)

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اشک تر قطرۂ خوں لخت جگر پارۂ دل
ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۵)

مستوجب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں
ہر چند کہ جلتا ہوں پہ سرگرم وفا ہوں

اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں
ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردود صبا ہوں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب
بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

سینہ تو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقت دعا میرؔ کہ اب دل کو لگا ہوں

(۶)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

دیکھا ہے مجھے جس نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعث آشفتگی طبع جہاں ہوں

ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں
در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

(۷)

رکھیے گردن کو تری تیغ ستم پر ہو سو ہو
جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ہو سو ہو

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑا اے دیدۂ تر ہو سو ہو

بندہ میں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر ۔ یہ فضولی ہے فقیری میں میسر ہو سو ہو
صاحبی کیسی؟ جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا ۔ پھر تو خواری بے وقاری بندہ پرور ہو سو ہو
کہتے ہیں ٹھہرا ہے تیرا اور غیروں کا بگاڑ ۔ ہیں شریک اے میرؔ ہم بھی تیرے بہتر ہو سو ہو

(۸)

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں ۔ مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں ۔ کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے ۔ تعجب مجھے ہے عجب ماسوا سے
ٹک اے مدعی! چشمِ انصاف وا کر ۔ کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت ۔ کہو میرؔ جی! آج کیوں ہو خفا سے

(۹)

اپنی ہستی حباب کی سی ہے ۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس ہی عالم پر ۔ یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز ۔ اسی خانہ خراب کی سی ہے

(۱۰)

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم ۔ جی کچھ اچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں ۔ رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے
آنکھوں ہی میں رہے ہو، دل سے نہیں گئے ہو ۔ حیران ہوں میں، یہ شوخی آئی تمہیں کہاں سے

اِتنی بھی بد مزاجی! ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

مرزا رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام سودا تخلص ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے دلی ان کا مولد و مسکن ریختہ گوئی میں شاہ حاتم کے شاگرد ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ چلے گئے ۱۱۹۵ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔ ان کا کلام رنگا رنگ ہے کہیں صاف و سادہ کہیں تشبیہ و استعارہ۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال بخلاف میر کے زیادہ۔ اگرچہ اصناف سخن میں استاد مسلم ہیں۔ مگر ان کے قصائد اور ہجویں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

(۱)

شیر

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردہ کو تعین کے در دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی۔ تو موسم ہے خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

(۲)

گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

دماغ جھڑ گیا آخر یہ تیرا۔ اے نمرود!
چلا نہ پشہ سے کچھ بس تری خدائی کا

طلب نہ چرخ سے کر نان رحمت اے سودا
پھرے ہے اپنا وہ کاسہ لیے گدائی کا

(۳)

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم۔ اے آہ شرر بار! کہ جل جاؤں گا

قطرۂ اشک ہوں پیارے! مرے نظارہ سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

اس مصیبت سے تو مت مجکو نکال اب گھر سے
تو کہتے آج ہی جائیں کہوں "کل جاؤں گا"

چھیڑ مت باد بہاری! کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

کہتے ہیں وہ جو ہو سودا کا قصیدہ ہی خوب
اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

(۴)

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

دیکھیے! درماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

کیونکر کوئی کھائے ترا اب فریب
حال مرا سب کو خبر کر گیا

ایک جو مانند گل اس باغ سے
خرم و خندان ہو گذر کر گیا

آن کے شبنم کی طرح دوسرا
شام سے رو رو کے سحر کر گیا

کیا تجھے اب فائدہ اس فکر سے
ہر کوئی اک طرح بسر کر گیا

(۵)

گدا دستِ اہل کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اُسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

(۶)

مجمر کا دخل کیا ہے محفل میں نفتگاں کی
بو داغ دل کی اپنے ہم عود جانتے ہیں

اپنا چراغ دل کا جس دم سے بجھ گیا ہے
ہم گھر کو آسماں کے پردود جانتے ہیں

آئینہ ساز ہی اُن کو ہے کفر اے سکندر
جو مردِ شکل ہستی نابود جانتے ہیں

جس خشت کو اُٹھا کر دیکھیں وہ چشمِ دل سے
صورت کو اپنی اُس میں موجود جانتے ہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل سے ہے
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جانتے ہیں

عجز و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم عبد سے جُدا کب معبود جانتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے؟ کہ بیدہ آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

(۷)

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اِس چمن سے صبا چشمِ تر گئی

لیجیو اثر قبول کہ تجھ تک ہماری آہ
سینہ سے ارمغاں لیے داغِ جگر گئی

دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں
زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی

خانہ خراب دل تو ہی لیکن میں کیا کہوں
جیسی بلائے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ مجھ بغیر
اِس گفتگو سے فائدہ پیارے گذر گئی

ظالم کروڑ گل کا گریباں ہوا ہے چاک
اک عندلیب گر اجل اپنی سے مر گئی

پروانہ کون سا نہ جلا شام کو کہ شمع
روتی ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی

(۸)

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے (دیکھو تو) کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا۔ ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

زبان شکوہ سوا اب زمانہ میں ہیہات!
کوئی کسی سے بہمدیگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر! صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم خارِ دشت پر۔ مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ دہلی کے ارباب طریقت وارشاد سے تھے۔ ان کا دیوان ریختہ نہایت مختصر ہے غزلیات تمامتر عارفانہ خوبی زبان و سادگی بیان کے لحاظ سے مقبول خاص و عام۔ میر و مرزا کے ہمعصر تھے سنہ ۱۱۹۹ ہجری میں بعمر ۶۶ سال رحلت فرمائی۔

(۱)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا　　حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
اس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے　　کیا تاب ہو گذر ہووے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن　　آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے　　اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے درد! کھلی تھی　　کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۲)

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما　　اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم　　نہ کیا تو نے رحم پر نہ کیا
آپ سے ہم گذر گئے کب کے　　کیا ہے! ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کونسا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آہ!　　خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درد　　بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

یکر ازل سے تا ابد ایک آن ہے　　گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا
رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری ادھر　　یا رب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس۔ نہ ارادہ کلاہ کا

سو بار دیکھیں میں نے تری بیوفائیاں
تس پر بھی نت غرور رہے دل میں نباہ کا

اے دردؔ! چھوڑتا ہی نہیں مجکو جذبِ عشق
کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

(۴)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے۔ جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جا۔ ابھی
دامن نچوڑ دیں۔ تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال؟ جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئنہ ہوں۔ پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات۔ نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوسِ رنگ و بو کریں

(۵)

یاں عیش کے پردہ میں چھپی دل شکنی ہے
ہر بزمِ طرب جوں مژہ برہم زدنی ہے

آگے جو بلا آئی تھی سو دل پہ ٹلی تھی
اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

اے دردؔ! بتا کس سے کہوں رازِ محبت
عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(۶)

دیکھیے جس کو یاں اسے اور ہی کچھ دماغ ہے
کرمکِ شب چراغ بھی گو ہمہ شب چراغ ہے

غیر سے کیا معاملہ؟ آپ ہیں اپنے دام میں
قید خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے

حال مرا نہ پوچھیے میں جو کہوں سو کیا کہوں
دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ سو داغ داغ ہے

سنتے ہیں یوں کہ آہ تو ہم ہی میں چھپ رہا کہیں
اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے

غفلتِ دل ہوئی مگر پنبۂ گوشِ خلق دردؔ!
بلبلِ داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

قصائد

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

تختۂ کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہِ قلم
دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکلِ علم

ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات
یہی لشکر ہے یہی فوج یہی خیل و خدم

ہے فصاحت جو مصاحب۔ تو بلاغت ہے ندیم
وزرا ہیں سر و دیدبۂ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو مضامیں۔ تو معانی ہیں لطیف
ہیں یہی گنج و خزائن وہی دینار و درم

اہلِ دفتر نے جو کی کھول کے بستوں کو نشست
گردنِ منشیِ گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم ہیں دیں جاگیریں
شقّے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم

وقت دربار ہوا۔ جمع ہوئے مجرائی
عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حِکَم

سامنے آنے لگے خیر طلب بہرِ سلام
ہر دہا تھا جو ادب کا۔ وہ پکارا بہیم

روبرو خسروِ جم جاہ فلک فر کے نگاہ
تا ابد سلطنت پشت و پناہِ عالم

ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل
مسندِ حکم ہوئی مطلعِ انوارِ قدم

روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ
حکمت الدولہ۔ جو تھا منشیِ یاقوت رقم

عرضیاں گذریں خلائق کے برآئے مطلب
لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابوابِ کرم

بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی
نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اس دم

کہ ملازم ہیں جو سرکار کے یہ دانش و وہم
در دولت پہ ہے ہنگامہ۔ لڑے ہیں باہم

بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی
کہ بہم گتھ گئے ہیں صورتِ خطِ توام

حکم عالی یہ ہوا۔ جلد کرو حاضر بزم
دیکھیں کیا کہتے ہیں؟ خود دونوں میں ہم ہونگے حکم

حاضر بزم ہوئے وہ۔ تو ہوا یہ ایما
کیوں لڑے؟ کیا سبب جنگ ہے؟ آگاہ ہوں ہم

عرض دانش نے یہ کی۔ روز ابد تک قائم
یہ حکومت۔ یہ ایالت۔ یہ شہامت یہ حشم

بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں
حکمرانانِ زمانہ روسائے عالم

ایک حاکم ہے۔ فلک جاہ۔ خردمند۔ ذکی
صاحب علم وہنر۔ معدنِ اخلاق وکرم

نام ہے **کلب علی خان** بہادر جم جاہ
جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر وجم

علم میں حلم میں۔ جود وکرم وہمت میں
ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم!

جس میں جو بات ہو کیونکر اسے کوئی نہ کہے
پیش انصاف گزیں حق کا چھپانا ہے ستم

میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا
بلکہ بارادۂ انکار میں منکر نے قدم

کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن
کارخانہ ہے خدا کا۔ نہیں خالی عالم

کیسے کیسے نہیں گذرے ہیں جہاں میں نامی؟
خواجگان عربستان وصنادید عجم

سارے عالم میں ہے سحباں کی فصاحت مشہور
سارے آفاق میں کسریٰ کی عدالت ہے علم

کس کو معلوم فلاطوں کی نہیں ہے حکمت؟
حلم نادر ہے عیاں۔ جلوہ نما عشرتِ جم

چار سو ہمت حاتم کا ہے آوازہ بلند
شش جہت پہ ہے عیاں سب جری تھا رستم

تو جو کہتا ہے۔ کہ ان سب سے ہے بڑھ کر کوئی
زعم باطل ہے فقط مانتے ہیں کب اسے ہم

میں یہ کہتا ہوں میں دعوی میں ہوں اپنے صادق
ہیں دلائل۔ جو ہوں گوش شنوا گوش اصم

کچھ یہ سنتا نہیں انکار یہ باندھی ہے کمر
گفتگو سے طرفین آپ سنیں ہو کے بہم

ہو گیا حکم۔ کہ ہاں محکمۂ بحث ہو گرم
ایک ایک بات کا ہو فیصلہ۔ لا ہو کہ نعم

(۲)

فصلِ گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں — بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں ہر باغباں
ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے — جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پہ — کر رہی ہیں سجدۂ شکرِ خدا اے انس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار — جی اٹھے جو ہوگئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں — رقص میں ہیں ہر طرف طاؤس۔ ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں؟ آ کر دیکھ لیں — صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا — نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں
لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست — نرگسِ شہلا نے رکھی مے فروشی کی دکاں
وابستہ تاک میں خوشے نظر آنے لگے — جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں
سیمِ غنچہ کیوں نہ بیجد ہو زرِ گل بے شمار — رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں
ہر روش پر بیٹھی ہے بزازن بن کر خرمی — جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں
فیضِ شبنم نے دیے اشجار کو آبی لباس — بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں
نو عروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق — بھیجنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار — ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں دامن کشاں
ہے مبارک فال۔ کوئی ہونے والی ہے خوشی — ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں
جان پھولوں میں پڑی۔ زندہ ہوئی خاکِ چمن — ہے دمِ جاں بخش۔ عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں
قمریوں کا قول ہے "ہم ہیں طیورِ باغِ خلد" — سرو کہتا ہے کہ میں ہوں طوبیٰ باغِ جناں
صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ — مرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر کہاں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں ہے محیط مشرق و مغرب برنگ کہکشاں
پائے گر سورج کبھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ پھول جائے مہر جنبش مثل قطب آسماں
چودھویں کا چاند ہو جو چاندنی کا پھول ہے چادر مہتاب ہو فرش فضائے بوستاں
سیر کو جو آئے۔ اس کا ناف آہو ہو مشام گیسوئے مشکین سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں
دیدۂ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے خواب میں کرتا ہے سبزہ سیر گلزار جناں
ہے تبسم غنچۂ گل کا کہ تیغ آبدار نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبھوتے ہیں سناں

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما ایل۔ ایل۔ ڈی (اڈنبرا)

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام پر اس میں شک نہیں جلسہ ہے اب کا بے ہنگام
کسی طرف سے بھی آواز خوش نہیں آتی کچھ ایسا بگڑا ہے نظم لیالی و ایام
وہ بمبئی۔ کہ جو تھا مرکز تجارت ہند وبا نے کر دیا گویا کہ اس کا کام تمام
مقام۔ رت جگے رہتے تھے جن میں ساری رات وہ کر رہے ہیں پڑے بھائیں بھائیں اول شام
حکایتیں جو مصائب کی اُن کے سنتے ہیں تو دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں ہم کلیجہ تھام
خدا ہی جانے ہوئیں کتنی عورتیں بیوہ خدا ہی جانے ہوئے بچے کس قدر ایتام
جلا وطن ہوئے کتنے کہ جو نہ ٹھہر سکے کوئی سلون کو بھاگا۔ کوئی گیا آسام
مگر پناہ نہیں آہوئے حرم کو بھی کہیں جہان میں جس دم قضا بچھائے دام
مرا تو کرتے ہیں لیکن نہ یوں مفاجاۃً تپ آئی صبح کو۔ دن چڑھتے ہو گیا سرسام
ہوئی دوپہر۔ تو دنیا سے ہو گئے رخصت کہ تپ کے ساتھ ہی آیا تھا مرگ کا پیغام
ہزاروں آدمی گر جاں بحق ہوئے۔ تو ہوئے یہ کیا غضب ہے! ہوئی طب رہی سہی بدنام
علاج جتنے کیے سب کے سب گئے بے سود بتائیں جتنی تدابیر۔ سب رہیں ناکام

بس اب کھلا کہ طبابت کی اتنی ہستی ہے — کہ جھٹ سے لکھدیا خیسانده از برائے زکام
سکنجبین کو فرمایا قاطع صفرا — مریض ہیں کو تبلایا روغن بادام
بنی جب آن کے جانوں پہ اور رہے عاجز — تو ایسی طب کو سلام اور سلام اور سلام
دوا کا حیلہ ہے۔ گر وقت ابھی نہیں آیا — تو ہوتے دیکھا ہے چٹکی سے خاک کی آرام
اور آن پہونچا ہے وعدہ۔ تو بس سمجھ رکھو — دُعا۔ دوا کوئی تدبیر بھی نہ آئے کام
ادھر وبا نہیں۔ پر قحط اور گرانی سے — مچا ہوا ہے ہر اک گھر میں رات دن کہرام
غلط کہ عید ہوئی۔ کوئی ہم کو سمجھا دے — یہ فاقے کیسے؟ اگر ہو چکا ہے ماہ صیام
ہمیں تو بے زری و مفلسی نے مار دیا — وگرنہ کیا تھا۔ جو ہوتے گرہ میں اپنی دام
وبا و قحط سے باقی تھا کیا اُجڑنے میں؟ — مگر بھلے کو نگہبان خلق تھے حکام
کجا فراغ! خوشی کیسی! کس کا اطمینان! — ان آفتوں کے سبب ہو رہی ہے زیست حرام
پھری ہوئی ہے خدا کی نظر کچھ ان روزوں — کہ ہم نے توڑے ہیں اس کے ضوابط و حکام
بساط یہ ہے۔ اور اس پر گناہ کی جرأت — نمود یہ ہے۔ اور اس پر قصور کا اقدام
سوائے توبہ نہیں کچھ علاج قہر خدا — طبیب ہو کہ طبابت کسی پہ کیا الزام
وہ چاہے مار دے ہم سب کو بے وبا بے قحط — بقا تجھی کو ہے۔ اے ذو الجلال والاکرام!
گناہگار ہیں۔ پر معترف قصور کے ہیں — وسیع ہے تری رحمت۔ کرم ہے تیرا عام
جئیں۔ تو خوش جئیں۔ اور امن عافیت سے جئیں — جب آئے موت۔ تو سب کا بخیر ہو انجام

حکیم مومن خاں مومن

کوئی اس دور میں جیسے کہو نکر — ملک الموت ہے ہر ایک نشتر
داد خواہوں کے شور سے دیکھو — چونک پڑتا ہے فتنہ محشر

آئینہ نے بھی اس زمانہ میں | تیغ کے سے نکلے ہیں جوہر
ہے پے اشتیاق ویرانی | شاہ فرہاد و بے ستوں کشور
نہ امیروں کو پاسِ بندیِ عدل | نہ رعایا مطیع و فرماں بر
اس کو سور ستم زماں کا خطاب | جو کرے قتل خرد سالہ پسر
چمن آرا کو رسم پیرائش | اک بہانہ ہے بہر قطع شجر
پا کے الزام دست خالی سے | فلسفی پیٹتا ہے اپنا سر
آب و ناں کے لیے گرو رکھیں | رستمانِ زمانہ تیغ و سپر
شعرا کو یہ آرزوے شعیر | خوانِ عیسی ہے نیم خوردۂ خر
کام آئے نہ نغمۂ شیریں | طوطیوں کو ہے حسرت شکر
سروران سپہر مرتبہ ہیں | بلکہ جاہل نوازدوں پرور
واعظوں کی زباں پہ آتا ہے | برملا شکوۂ قضا و قدر
کہے مفتی سوال کو واجب | کسب مفقود جو ہوئے یکسر
پھلے پھولے ہیں بے خرد کیا دور | بید مجنوں بھی گر لے آئے ثمر
سختی و کاہلی کی دولت سے | دامنِ کوہ میں ہیں لعل و گہر
باندھتے ہیں سخن سرا موزوں | کس طرح ہو نصیب سرو کو بر
قدردانی کا نام ہی نہ رہا | چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
ایک امیر سخن شناس نہیں | لاکھ ہیں شاعر ثنا گستر
اے لب یاوہ گوے ہرزہ درائے | بس کہاں تک یہ ناستودہ سمر
ہجو گوئی نہیں ہمارا کام | ایسی باتوں سے خامشی بہتر

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہاں مہ نو! سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ — بندہ عاجز ہے۔ گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص! — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام!
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لیکے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا! — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا؟ کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ — مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا۔ کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں۔ کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ! — قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھکو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریبِ عید ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون! — مجھکو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ و فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازل فلکی
کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام!
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا۔ تو مجھ سے سن
نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذو الجلال و الاکرام

شیخ ابراہیم ذوق

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا اسرار میں تصدیق و صفت
جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
ذہن میں سب مرے حاضر صور علمیہ
پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیت
چار و نا چار جو ترغیب سے یاروں کے کبھی
درس و تدریس پہ آجاتی تھی مجکو رغبت
کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت
کبھی تھی عرصۂ تدویر فلک کی مجھے سیر
کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وسعت
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش
کبھی ثابت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت

کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیح لغت

کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت

گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے
گہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیت

جوں مہندس کبھی مالوف بہ شکل و مقدار
جوں محاسب کبھی مصروفِ ضرب و قسمت

کبھی کرتا تھا قِران مہ و زہرہ پہ نظر
کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت

کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے
ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت

کبھی میں شاعرِ غرا و ادب دانِ بلیغ
نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت

کبھی کرتا تھا عروضی کا کبھی میں قافیہ تنگ
طبعِ موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کبھی میش نظر انجیل و زبور و توریت
کبھی مصحف میں نظر میری سرِ ہر آیت

کبھی با آگہی شاستر و بید و پُران
کروں اک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

آخرش دیکھا۔ تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا۔ تو ہاں بُلہ کو اہلِ جنت

فائدہ کیا؟ کہ جو ہر علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا؟ جو ہوئی آگہی ہر ملت

بے مقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر
دُور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کلفت

(۲)

واہ وا! کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا!
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

بھرتی ہوگیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار!
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دارالشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ اشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ سے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاج دہر سے یا نتک جنوں
ہوتا ہی لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
پائی یہ اصلاح صفرے نے کہ دنیا میں کہیں
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
راحت و آرام کا اس دور میں ہو دور دورہ
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی تھی صدف
آگیا اصلاح پر ایسا زمانہ کا مزاج
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
غرق جالا یا نتک اعضاے بدن سے درد نے
لاغروں کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شتاب
صبح صادق کے ہی گو سر میں سپیدی آگئی
بھوک کی شدت سے اُس کو اک نفس فرصت نہیں
رات بھر ٹھونسا کیا انجم کے تارے چرخ پیر
پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
پوست پھولا ہی خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہونچایا بہم
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہی جوں برگ حنا
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
بنگئی تریاک افیوں۔ زہر میٹھا ہو گیا
نیش کی جا نوش حنظل دیوے شربت کا مزا
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجاے آبلا
چاہیے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا
اب رکھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا
کہتا ہی بیمار بس کر مجکو ہے بالکل شفا
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جُدا
کیسے وہ ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
قرص سے خورشید کے جب تک کرے نا اشتا
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
یعنی ہی جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
جوں حباب اسکے نہیں مطلق شکم میں امتلا
جیسے لکھیوں ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاج اہل عالم پہ قریب اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بحظ استوار

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس اب
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

(۳)

پائے نہ ایسا ایک بھی دن عمر بھر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاط و طرب سے لبالب آج
اک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں

دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں
گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں

اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہو زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں

افراط انبساط سے ہے کیا عجب اگر
مثل حباب جامے سے ہو باہر آسماں

شادی کی اسکی دھوم ہے آج آسمان تک
تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں

فرزند شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کو ہے جس کے جھکاتا سر آسماں

ہے اس کی بارگاہ میں مانند چوبدار
حاضر عصائے کاہکشاں لے کر آسماں

اس بیاہ کی نوید سے ہو اس قدر ہرا
ہو پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا کہ ٹھہر سکے دم بھر آسماں

فرد حساب صرف سے اس بیاہ کی ہو کم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

خواجہ الطاف حسین حالی

ہے عید یہ کس جشن کی یارب کہ سراسر
ہے جوبلی ہے جوبلی اک اک کی زباں پر

یہ عہد کہ گذرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے ہند کے حق میں کہیں بہتر

وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورۂ اخلاق
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

اس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے — تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھکر
اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع — جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب — جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیِ دختر
جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی — دی زندگی اک اور انھیں علم پڑھا کر
اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت — انساں کو نہ سمجھا کسی انسان نے کمتر
دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی — گویا وہ ستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر
نابود کیا اس نے زمانہ سے ٹھگی کو — اک قہر تھا اللہ کا جو نوعِ بشر پر
اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ — مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر
اے نازشِ برطانیہ اے فخرِ پرنس — اے ہند کے گلہ کی شباں ہند کی قیصر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گذرا — محمود نہ تیمور ہنیبل نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا — اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر
بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو — معمور مساجد ہیں۔ تو آباد ہیں مندر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا — سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر
گو منتِ قیصر سے ہے ہر قوم گرانبار — احساں مگر اسلام پہ ہیں اس کے گراں تر
اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری — ہر قوم کے ہیں پیر و جواں متفق اس پر
امید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو — راحت کی کسی سایہ میں جز سایۂ قیصر
گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر — کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر
ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک — آزادی و انصاف حکومت کے ہیں رہبر
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں — اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

قطعات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱) بے تمیزیِ ابنائے زماں

ازرہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
جنس تیری کس میں اور قدر و قیمت تیری ہیچ
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا!
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
مجھ میں اور تجھ میں مگر کرسکتے ہیں جو امتیاز
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں

تُو ہے وہ جو لے مبتذل تیرا برابر اور عدم
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم!
"گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم!
ہیں مبصّر ایسے اس بازار نا پرساں میں کم
تجھ سے اے الماس! لیکن اچھے رہتے ہیں ہم

(۲) جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو انگر
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت نہ ہے اقبال

جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی | پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

(۳) بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو! | ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز | جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہے بس ادھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت | تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
اگر پیل پڑے چوسر اور گنجفہ پر | تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک | کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا۔ تو جانو | کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر | تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا۔ تو سمجھو | کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ۔ تو پی جاؤ اتنی | رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بے حد۔ جو پینا تو آفت | غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظر بے مثل و نظیر | اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ | فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام | تیری رفتار قلم جنبش بالِ جبریلؑ
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم | تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ | بہ کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل

تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

تپش دل نہیں بے رابطۂ خوف عظیم
کشش دم نہیں بے ضابطۂ جر ثقیل

فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدہ کو سو بھی باشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماںؑ کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماںؑ جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی
ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر!
قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج۔ اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجکو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

خسروا! سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بُلبُلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تری دے ہے چمن کو جا کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پا رنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج
تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر
آگے ہمت کے تری گوہرِ شہوار کے گنج

حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش
دستِ حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ ترنج

شش جہت پر ہو جو غالب ترے انجہات
فتنے کو اُٹھنے میں جوں نرد ہو کیا شش و پنج

نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے
ایک سے ایک موافق۔ کہ مرنجان و مرنج

تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم
صفحۂ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج

لایا ہے معنیِ رنگیں سے یہ لعلِ خوشرنگ
ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج

خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم کہ ہے
رنگِ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج

بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
در تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

مُسدّسات

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام انیس تخلص میر حسن دہلوی کے نامور پوتے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی ان کی چار دانگ ہند میں مشہور و مسلم تھی۔ فصاحت بیان اور لطافت محاورہ میں ان کا کلام اس پایۂ بلند پر پہونچا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔

صفت صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گل مہتاب پر خزاں مُرجھا کے گر گئے ثمر و شاخ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا۔ وہ فضا۔ وہ نور خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو۔ مَلک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی اُدھر چرخ پر بہار وہ بارور درخت۔ وہ صحرا۔ وہ سبزہ زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

تلنے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

غریب الوطنی

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں — راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
مشغول ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں — پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد — جاتی نہیں افسردگیِ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد — ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر — منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفر خوف و پریشانیِ خاطر — شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لیے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے — منزل پہ پہونچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے — ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی — تھک کر بھی جو بیٹھے تو اُٹھاتا نہیں کوئی

صفتِ تیغ

تھا صورتِ آئینہ تمام اُس کا بدن صاف
خوں پیتی تھی۔ پر دیکھو تو منہ صاف دہن صاف
چلتی تھی جو سن سن۔ یہ نکلتا تھا ہرن صاف
ہوں میں تو وہ جاروب۔ کہ کر دیتی ہوں چمن صاف
نا اہل ہیں۔ نامرد ہیں، ناپاک ہیں اعدا
میں برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

مغفر سے جھلم کاٹ کے گردن میں در آئی
گردن سے سرکنا تھا۔ کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا۔ کہ بس تن میں در آئی
تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی
بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے
اک برقِ غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

تیری کبھی۔ گہ خوں میں نہا کر نکل آئی
ٹھہری کبھی۔ غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ۔ موج میں جا کر نکل آئی
منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی
کیا ڈر اُسے طوفاں کا۔ جو چالاک ہو ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو۔ تو پیراک ہو ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا
تیزی پہ جسے ناز تھا۔ سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر۔ نہ افعی میں یہ سم تھا
یہ فتح کی جویا تھی۔ قد اس واسطے خم تھا
بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

(۲)

بجلی سی جو گر کر صفِ کفار سے نکلی
آوازِ بزن تیغ کی جھنکار سے نکلی

گھر ڈھال میں ڈوبی۔ کبھی تلوار سے نکلی ۔ در آئی جو پیکاں میں۔ تو سوفار سے نکلی
تھے بند خطا کاروں پہ دامن و اماں کے
چلّے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کماں کے

افلاک پہ چمکی کبھی سر پر کبھی آئی ۔ کوندی کبھی جوشن پہ۔ سپر پر کبھی آئی
گھر پڑ گئی سینہ پہ۔ جگر پر کبھی آئی ۔ تڑپی کبھی پہلو پہ۔ کمر پر کبھی آئی
طے کر کے پھری۔ کونسا قصّہ تھا فرس کا؟
باقی تھا جو کچھ کاٹ۔ وہ حصّہ تھا فرس کا

سب پاؤں جدھر ہاتھ سے جلتی ہوئی آئی ۔ ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی ۔ پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن۔ رنگ زمرّد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو! پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سر ٹیکے۔ تو موج اُس کی روانی کو نہ پہونچے ۔ قلزم کا بھی دھارا ہو۔ تو پانی کو نہ پہونچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہونچے ۔ خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہونچے
دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اس کی بڑی تھی
برچھی تھی کٹاری تھی سروہی تھی چھری تھی

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی ۔ دم خم بھی۔ لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی۔ پانی بھی ہوا بھی ۔ امرت بھی۔ ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کیا صاحبِ جوہر تھی عجب ظرف تھا اُس کا
موقع تھا جہاں جس کا۔ وہیں صرف تھا اُس کا

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اُس کا — تھا لشکرِ باغی میں ازل سے عمل اُس کا
ڈر جاتی تھی منہ دیکھ کے بزدل اجل اُس کا — تھا قلعۂ چار آئینہ گویا محل اُس کا

اِس در سے گئی۔ کھول کے وہ در نکل آئی
گہ صدر میں بیٹھی۔ کبھی باہر نکل آئی

تیروں پہ گئی برچھیوں والوں کی طرف سے — جا پہونچی کمانداروں پہ بھالوں کی طرف سے
پھر آئی سواروں کے رسالوں کی طرف سے — منہ تیغوں کی جانب کیا ڈھالوں کی طرف سے

بس ہو گیا دفترِ نظری نام و نسب کا
لاکھوں تھے تو کیا! دیکھ لیا جائزہ سب کا

پہونچی جو سپر تک۔ تو کلائی کو نہ چھوڑا — ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو۔ لڑائی کو نہ چھوڑا — تیزی کو۔ رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

چار آئنہ والوں کو نہ تھا جنگ کا یارا — چھ رنگ تھے سینے۔ تو کلیجہ تھا دو پارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں تاب خدارا — بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا

جوشن کو سنا تھا کہ حفاظت کا محل ہے
اِس کی نہ خبر تھی۔ کہ یہی دامِ اجل ہے

بدکیش۔ لڑائی کا چلن بھول گئے تھے — ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
سب حیلہ گری عہد شکن بھول گئے تھے — بیہوشی میں ترکش کے دہن بھول گئے تھے

معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے کہ نہیں ہے — چلاتے تھے قبضہ میں کماں ہے کہ نہیں ہے

صفت اسپ

لکھتا ہے ادہمِ قلم اب سرعتِ عقاب
پستی میں سیل ہے۔ تو بلندی میں ہے سحاب
نعل اس کے ماہِ نو ہیں۔ تو سُم رشکِ آفتاب
سرعت میں برق گرم روانی میں جیسے آب
اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی موج ہے

نازک مزاج۔ نسترن اندام۔ تیزرو
اُس کا نہ اک قدم۔ نہ زغند میں ہرن کی سو
گردوں مسیر بادیہ پیما و برق دو
دوڑ میں سے نہ کاہ ملی تھی اُسے۔ نہ جَو
رفتار میں ہوا تھا۔ اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی۔ نہ چھل پل میں فرق تھا

صرصر سے تند۔ پویہ سے سُبکرو۔ ہوا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز
چالاک فہم و فکر سے۔ ذہن رسا سے تیز
جانے میں اڑ کے ہُدہُدِ شہرِ سبا سے تیز
ذی جاہ تھا۔ سعید تھا۔ فیروز بخت تھا
رہوار کیا! ہوا پہ سلیمانؑ کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُٹھا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
برہم کیا صفوں کو۔ پروں سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی۔ کہ وہی کا وار تھا

(۲)

کوتاہ و گرد و صاف۔ کنوتی کمر کفل
کیا خوش نما کشادگی سینہ و بغل!

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل ‏ ‏ پھرتا تھا اس طرح ۔ کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی ۔ کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لیے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند ‏ ‏ سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند ‏ ‏ نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست ۔ شیر کی آمد ۔ پری کی چال ‏ ‏ کبکِ دری خجل ۔ دلِ طاؤس پائمال
سبزہ شبک روی ہیں قدم کے تلے نہال ‏ ‏ اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا ۔ کبھی رہوار بن گیا ‏ ‏ آیا عرق ۔ تو ابرِ گہربار بن گیا
گہ قطب ۔ گاہ گنبدِ دوار بن گیا ‏ ‏ نقطہ کبھی بنا ۔ کبھی پرکار بن گیا

حیراں تھے اس کی گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

ایک مثمّن

از مؤلّف

کیفیت قلعۂ اکبر آباد

یارب! یہ کیسی مشعل کشتہ کا دُھواں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے
ہاں! دورِ گذشتہ کی مہابت کا نشاں ہے
یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
بانیِ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اُڑتا تھا یہاں پرچم جم جاہیِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہیِ اکبر

باہر سے نظر ڈالیے اِس قلعہ پہ یک چند
گویا کہ ہے اک سُورما مضبوط۔ تنومند
کیا پارۂ سنگین کا پہنا ہے قزآگند!
برپا ہے لبِ آب جمن صورتِ الوند
یا ہند کا رجپوت ہے۔ یا ترک سمرقند
ریتی کا قزآگند پہ باندھا ہے کمربند

مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لیے برج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں
کی ہے شعرا نے صفت طاق فریدوں
گو ہمسر کیواں ہے۔ نہ ہم پلّۂ گردوں
پُر شوکت و ذی شان ہے اس کا رُخ بیروں
معلوم نہیں اس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں

پیلان گراں سلسلہ با ہودج زریں
اس در سے گذرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزن تدبیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجع توقیر یہاں تھا
القصہ کبھی عالم تصویر یہاں تھا

یا طنطنۂ دورِ جہانگیر یہاں تھا
یا مجمع ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
دنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّے کہ جہاں عام تھا دربار
وہ سقف زراندود ہے مانند چمن زار
اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار

آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
سرہنگ کمر بستہ۔ نہ وہ مجمع حضار

کہتا ہے کبھی مرکز اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیت کو مرا اوج تھا منظور
شاہان معاصر کا معین تھا یہ دستور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پرنور

نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
کرتے تھے سفیران ذوی القدر کو معمور
آوازہ مری شان کا پہونچا تھا بہت دور

اکناف جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور۔ وہ دیوان کہاں ہیں؟

وہ شاہ۔ وہ نوئین۔ وہ خاقان کہاں ہیں؟
خدام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟

وہ دولت مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟　　فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت　　تاباں تھے جہاں نیرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت　　آتی تھی جہاں فتح ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت　　سیاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
"تھا مخزن اسرار یہی تاجوروں کا"

اورنگ سیہ رنگ جو قائم ہے لب بام　　بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام
اشعار میں ثبت اس پہ جہانگیر کا ہے نام　　شاعر کا قلم اس کی بقا لکھتا ہے مدام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام　　سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام

فرسودگی دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لیے خاموش ہے او تختِ جگر ریش؟　　کس غم میں سیہ پوش ہے کیا سوگ ہے درپیش؟
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش؟　　جوگی ہے ترا پنتھ کہ صوفی ہے ترا کیش؟
بولا کہ زمانہ نے دیا نوش کبھی نیش　　صدیاں مجھے گذری ہیں یہاں تین کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

رنگیں محل اور برجِ مثمن کا وہ انداز　　صنعت میں ہے بے مثل تو زینت میں سرافراز

یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آوازہ — گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیرازہ
اب کون ہے؟ بتلائے جو کیفیت آغازہ — زنہار! کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے نازہ

جن تاروں کے پر تو سے تھا یہ برج منوّر
اب ان کا مقابر میں تہ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب — فوّارے شکستہ ہیں۔ تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جام بلوریں ہیں۔ نہ وہ گوہر نایاب — وہ چلمن زرتار۔ نہ وہ بستر کم خواب
ہنگامہ جو گذرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب — یہ معرض خدام تھا۔ وہ موقف حجّاب

وہ بزم نہ وہ دَور۔ نہ وہ جام۔ نہ ساقی
ہاں! طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

مستور سراپردہ عصمت میں تھے جو گل — سو وہ وہ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کل
کچھ خیری فرغانہ تھے۔ کچھ لالۂ کابل — پھر مولسری ہند کی ان میں گئی مل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامل — تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمل

سیاح جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالات مرکب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد — ہوتی تھی تو لادان میں کیا کیا دہش و داد
زنجیر عدالت بھی ہوئی تھی یہیں ایجاد — جو سمع شہنشاہ میں پہونچاتی تھی فریاد
وہ نورجہاں اور جہانگیر کی اُفتاد — اس کاخ ہمایوں کو یہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھیے وہ مسجد و حمام زنانہ — وہ نہر۔ وہ حوض۔ اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ — ہے طرز عمارت سے عیاں شان شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ — ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصل خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نورجہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھپوری رہتی تھی بائی — تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
دیکھا اُسے جا کر۔ تو بُری گت نظر آئی — صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دُہائی — ممکن نہیں طوفان حوادث سے رہائی

جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گل و لالہ
اب نسل ابابیل میں ہے اس کا قبالہ

وہ مسجد زیبا۔ کہ ہے اس بزم کی دلہن — خوبی میں یگانہ ہے۔ و لے سادہ و پرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان۔ تو ہیں دودھ سا آنگن
کافور کا تودہ ہے۔ کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن

بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہیں یاں قوت احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے — سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تار نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — ہر در میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
نے شمع۔ نہ فانوس۔ نہ بتی۔ نہ دیا ہے — ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے

چلیے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور — نظارہ کی دو مجکو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اُس نے کہانی — کچھ حالت موجودہ با این سحر بیانی
"اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — فواروں کے دل میں بھی ہے اک درد نہانی
تسبیح۔ نہ تہلیل۔ نہ تکبیر و اذاں ہے
"بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا — مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا — ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا — جو کچھ تھا گذر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکیں

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام و لیالی — جو واقعہ جیسی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان۔ ہر اک منزل عالی — عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند۔ اہالی۔ نہ موالی — جز ذات خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی
یہ جملہ محلات۔ جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب کند ہوئی دولت مغلیہ کی تلوار — اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوان طلا کار
تب ایک جو تھا لشکر انگلش کا سپہدار — افواج مخالف سے ہوا برسر پیکار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان۔ یہ دیوار — کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار
ہے گردشِ ایام کے حملوں کی کسے تاب

پھر قلعۂ اکبر ہی میں کیا تھا پرِ سرخاب!

آخر کو مخالف کی شکستہ ہوئی قوت
لہرانے لگا پھر علمِ امن و حفاظت
یہ بات نہ ہوتی۔ تو پہنچتی وہی نوبت
اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمت
دیوار گری آج۔ تو کل بیٹھ گئی چھت

حکامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برج حمل و ثور
اکبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور
ہر چند گذر جائیں بہت قرن بہت دور
اس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور

انجینیروں کی بھی مرمت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے فقط ناموری ہے

او اکبرِ ذی جاہ! تری عزت و تمکیں
کندہ ہیں دلوں میں تری الفت کے فرامیں
گو حملہ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں
محتاجِ مرمت ہے۔ نہ مستلزمِ تزئیں
ہے تیری محبت کی بنا اک دژِ رزیں
زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تری صحبت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا
اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
پچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا

آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھول

ہو کہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم
بھرتا ہی ہر اک فرقہ محبت کا تری دم
رتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلّم

شہرت ہو ترے نام کی سو قلعوں سے محکم
لکھتے ہیں مورخ بھی تجھے اکبر اعظم
یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم

گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزت ترا ہر سینہ میں تحریر

رباعیات

خواجہ الطاف حسین حاؔلی

(۱)

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں. دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع۔ جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

(۲)

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پاسے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

(۳)

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

(۴)

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

از مؤلف

(۱)

تیزی نہیں۔ منجملۂ اوصافِ کمال
کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی
ہاں! راہ طلب میں شرط ہے استقلال

(۲)

گر نیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے — یا بدمنشی سے کچھ بُرائی کی ہے
اپنے ہی لیے ہے سب نہ اوروں کے لیے — اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے

(۳)

دین اور دنیا کا تفرقہ ہے مہمل — نیت ہی پہ موقوف ہے تنقیح عمل
دنیا داری بھی عین دین داری ہے — مرکوز ہو گر رضائے حق عزّ و جل

(۴)

دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز — ڈھونڈھا۔ تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا پانا ہے سب فضولی اپنی — یہ خبط نہ ہو مجھے خدایا ہرگز

امیر مینائی

(۱)

گھر چھٹنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہی لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہوکر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

(۲)

بالفرض حیات جاودانی تم ہو — بالفرض۔ کہ آب زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملو۔ تو خاک سمجھیں تم کو — لیں نام نہ پیاس کا۔ جو پانی تم ہو

مرزا غالب

(۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ		ہے صفر۔ کہ افزائش اعداد کرے
	(۲)	
ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے؟ گن کر دیوینگے ہم دعائیں سو بار		بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے
	میر انیس	
	(۱)	
پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی۔ تو کہا		ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے "رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے"
	(۲)	
جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے ہے بحر جہاں میں عمر مانندِ حباب		جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے غافل! اس زندگی کو کیا سمجھا ہے
	(۳)	
ہشیار! کہ وقت ساز و برگ آیا ہے محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا		ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہے "چلیے۔ اب چوبدار مرگ آیا ہے"
	(۴)	
گلشن میں پھروں۔ کہ سیر صحرا دیکھوں ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے		یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں حیراں ہوں۔ کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
	(۵)	
انساں ہی کچھ اس دو میں پامال نہیں		سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں

اندیشۂ آشیان و خوفِ صیاد
مرغانِ چمن کبھی فارغ البال نہیں

(۶)

ہر طرح سے یہ سراے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر تقی

(۱)

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

(۲)

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیے
مائل دل تنگ کو قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر!
سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے

(۳)

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

تمام شد حصۂ نظم